مضامین سرسید کے موضوعات، مواد اور زبان کا مطالعہ

تحقیقی مقالہ

برائے۔ پی ایچ۔ ڈی۔ ڈگری (اردو)
ایل۔ این۔ متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ

2016

نگراں
ڈاکٹر برکت علی
ایسوسی ایٹ پروفیسر وصدر شعبۂ اُردو
ایم۔ ایل۔ ایس۔ ایم کالج، دربھنگہ

تحقیق کار
Farhat Bano
فرحت بانو
بنت عبدالرؤف
مریٹھا، جالے
ضلع: دربھنگہ، بہار

مضامین سرسید کے موضوعات، مواد اور زبان کا مطالعہ

تحقیقی مقالہ

برائے۔ پی ایچ۔ ڈی۔ ڈگری (اردو)
ایل۔ این۔ متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ

2016

نگراں
ڈاکٹر برکت علی
ایسوسی ایٹ پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو
ایم۔ ایل۔ ایس۔ ایم کالج، دربھنگہ

تحقیق کار
Farhat Bano
فرحت بانو
بنت عبدالرؤف
مریٹھا، جالے
ضلع: دربھنگہ، بہار

Dr. Barkat Ali

B.A. Urdu (Hons.)
M.A. Urdu (P.U.)
M.A. Persian (P.U.)
Ph.D.(P.U.)
Associate Prof. & HOD. Urdu.
M.L.S.M. College, Darbhanga
L.N.M.University, Darbhanga (Bihar)

Residence :
Kadirabad, P.O. - Lalbagh
P.S- L.N.M.U., Campus,
Darbhanga (Bihar)
Mob : 9334914908

Ref ....

Date. 12.05.16

Supervision Certificate

This is to certify that **Farhat Bano** worked under my supervision and guidance for the requisite number of terms and that her thesis entitled **" Contents and Langauges of Sir Syed's essays - A study"** embodies her own contribution.

(Superviser)

Barkat Ali. 12.05.16

(Dr. Barkat Ali)
Associate Prof. & HoD Urdu
MLSM. College, Darbhanga
LNMU. Darbhanga

فہرست

☆☆☆

پیش لفظ

(Fore Word)

پیش لفظ

سرسید اصلاح معاشرہ کے علمبردار، ماہر تعلیم، مذہبی مفکر، سیاسی مدبر، بے خوف اور نڈر صحافی، اچھے مؤرخ اور فکر انگیز تحریری صلاحیت کے مالک تھے۔ جس میدان میں انہوں نے قدم رکھا اپنا گہرا نقش ثبت کر دیا۔ وہ قومیت کا اعلیٰ ترین تصور اور ملک کی آزادی چاہنے والے ایک ایسے مرد مجاہد تھے جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ اس عظیم شخصیت کی گراں قدر خدمات کو دیکھ کر میں نے ان پر تحقیق کرنے کا فیصلہ کیا۔ یوں تو ان کی خدمات اور کارنامے پر بہت سی کتابیں، بہت سے مقالے اور مضامین لکھے جا چکے ہیں لیکن میں نے اپنے تحقیقی مقالے میں ان کے مضامین کے موضوعات، مواد اور زبان کا مطالعہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

امید ہے اس تحقیقی مقالے سے محققین، ناقدین، اساتذہ اور طلبا مستفید ہو سکیں گے۔ اس تحقیقی کام کی بامعنی تکمیل کی غرض سے اسے پانچ منسلک ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔

پہلے باب میں انیسویں صدی کی اردو نثر پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی گئی ہے۔

دوسرے باب میں سرسید احمد کی ابتدائی اردو نثر (سفر انگلستان سے قبل) کا جائزہ لیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں سرسید احمد کے مضامین کے مواد اور موضوعات کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

چوتھے باب میں سرسید احمد کے مضامین کی زبان اور اسلوب سے بحث کی گئی ہے۔ سرسید احمد کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو نثر کو اپنی زندگی ہی کا نہیں بلکہ پورے معاشرے کا ترجمان بنایا۔

پانچویں باب میں سرسید کے مضامین کا ان کی دوسری تحریروں سے موازنہ کیا گیا ہے۔

ان پانچ ابواب کے بعد محاکمہ پیش کیا گیا ہے اور آخر میں کتابوں کی فہرست دی گئی ہے۔

اس مقالے کی تکمیل میں تحقیق و تلاش کی جن صبر آزما منزلوں سے گزرنا پڑا اگر اس بات کا احساس پہلے سے ہوتا تو میں اس کام کو نہیں کر پاتی۔ بہر حال تلاش و تحقیق کے بعد جو کچھ حاصل ہوا اس سے دل و دماغ کو ایک طرح کا سکون و اطمینان حاصل ہوا۔

میں نے سرسید احمد خاں کے مضامین کے موضوعات، مواد اور زبان و اسلوب پر روشنی ڈالنے کی پوری کوشش کی ہے لیکن تحقیق کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا اس میں کام کی گنجائش ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ ممکن ہے کہ کچھ خامیاں رہ گئی ہوں اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

اس مقالے کی تکمیل میں بہت سے بزرگوں اور ساتھیوں کا پر خلوص تعاون شامل رہا ہے۔

ایل این متھلا یونیورسیٹی دربھنگہ شعبۂ اردو کے تمام اساتذہ کرام پروفیسر انیس صدری،

پروفیسر رئیس انور، ڈاکٹر فاراں شکوہ یزدانی اور ڈاکٹر محمد ارشد جمیل وغیرہ نے اس مقالے کی تکمیل میں کسی نہ کسی طرح سے میری مدد کی ہے۔ اس مقالے کے نگراں ڈاکٹر برکت علی ایسوسی ایٹ پروفیسر وصدر شعبۂ اردو، ایم ایل ایس ایم کالج، دربھنگہ نے ہر قدم پر میری رہنمائی کی ہے۔ اگر ان کی رہنمائی اور نیک مشورہ شامل نہ ہوتا تو شاید یہ مقالہ تیار نہ ہو پاتا۔ خدا انہیں صحت وسلامتی عطا فرمائے۔ اس مقالے کی تیاری میں میرے والد محترم عبدالرؤف سابق مکھیا، پنچایت مریٹھا، حلقہ جالے، ضلع دربھنگہ، شروع سے آخر تک میرے ساتھ ساتھ رہے ہیں۔ خدا انہیں ہمیشہ صحت مند رکھے اور لمبی عمر عطا فرمائے۔ اگر والد اور والدہ نے میرے اندر بچپن ہی سے خود اعتمادی پیدا نہ کی ہوتی تو شاید میں یہ کام نہ کر پاتی۔ اپنے شریک حیات محمد شفیع عالم صاحب کا ذکر کرنا ضروری سمجھتی ہوں کیونکہ انہوں نے میرے لیے ایسی فضا پیدا کی جس سے مجھے اس مقالے کو تکمیل تک پہنچانے کا موقع ملا۔ میرے بھائی امتیاز احمد اور اعجاز احمد اور بہن عصمت بانو، نعمت بانو، نکہت بانو، نزہت بانو اور راحت بانو کی نیک دعائیں اس مقالے کو تکمیل تک پہنچانے میں شامل رہی ہیں۔ خدا ان لوگوں کو کامیابی و کامرانی عطا فرمائے۔ اپنی بیٹی ادیبہ کے لیے دعا گو ہوں۔ اس کی موجودگی نے میرے اندر اس قدر حوصلہ اور اعتماد پیدا کیا کہ میں اپنے اس ارادے میں کامیاب ہو سکی۔

ڈاکٹر قیام نیّر، صدر شعبہ اردو، این جے مہیلا کالج لہریا سرائے، دربھنگہ نے ضرورت کے مطابق بہت سی کتابیں اور رسائل دستیاب کرائے، ساتھ ہی قدم قدم پر میری رہنمائی بھی کی۔ خدا انہیں کامیابی و کامرانی عطا فرمائے!

آخر میں خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ انہوں نے مجھے اس مشکل، اہم ترین اور صبر آزما کام میں کامیابی عطا فرمائی۔

Farhat Bano
9.05.16
فرحت بانو

فہرست

☆☆☆

پیش لفظ

(Fore Word)

پیش لفظ

سرسید اصلاح معاشرہ کے علمبردار، ماہر تعلیم ، مذہبی مفکر، سیاسی مدبر، بے خوف اور نڈر صحافی ، اچھے مؤرخ اور فکر انگیز تحریری صلاحیت کے مالک تھے۔ جس میدان میں انہوں نے قدم رکھا اپنا گہرا نقش ثبت کردیا۔ وہ قومیت کا اعلیٰ ترین تصور اور ملک کی آزادی چاہنے والے ایک ایسے مرد مجاہد تھے جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ اس عظیم شخصیت کی گراں قدر خدمات کو دیکھ کر میں نے ان پر تحقیق کرنے کا فیصلہ کیا۔ یوں تو ان کی خدمات اور کارنامے پر بہت سی کتابیں، بہت سے مقالے اور مضامین لکھے جاچکے ہیں لیکن میں نے اپنے تحقیقی مقالے میں ان کے مضامین کے موضوعات، مواد اور زبان کا مطالعہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

امید ہے اس تحقیقی مقالے سے محققین، ناقدین، اساتذہ اور طلبا مستفید ہوسکیں گے۔ اس تحقیقی کام کی بامعنی تکمیل کی غرض سے اسے پانچ منسلک ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔

پہلے باب میں انیسویں صدی کی اردو نثر پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی گئی ہے۔

دوسرے باب میں سرسید احمد کی ابتدائی اردو نثر (سفر انگلستان سے قبل) کا جائزہ لیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں سرسید احمد کے مضامین کے مواد اور موضوعات کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

چوتھے باب میں سرسید احمد کے مضامین کی زبان اور اسلوب سے بحث کی گئی ہے۔ سرسید احمد کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو نثر کو اپنی زندگی ہی کا نہیں بلکہ پورے معاشرے کا ترجمان بنایا۔

پانچویں باب میں سرسید کے مضامین کا ان کی دوسری تحریروں سے موازنہ کیا گیا ہے۔

ان پانچ ابواب کے بعد محاکمہ پیش کیا گیا ہے اور آخر میں کتابوں کی فہرست دی گئی ہے۔

اس مقالے کی تکمیل میں تحقیق وتلاش کی جن صبر آزما منزلوں سے گزرنا پڑا اگر اس بات کا احساس پہلے سے ہوتا تو میں اس کام کو نہیں کر پاتی۔ بہر حال تلاش وتحقیق کے بعد جو کچھ حاصل ہوا اس سے دل ودماغ کو ایک طرح کا سکون واطمینان حاصل ہوا۔

میں نے سرسید احمد خاں کے مضامین کے موضوعات، مواد اور زبان واسلوب پر روشنی ڈالنے کی پوری کوشش کی ہے لیکن تحقیق کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا اس میں کام کی گنجائش ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ ممکن ہے کہ کچھ خامیاں رہ گئی ہوں اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

اس مقالے کی تکمیل میں بہت سے بزرگوں اور ساتھیوں کا پرخلوص تعاون شامل رہا ہے۔

ایل این متھلا یونیورسیٹی دربھنگہ شعبۂ اردو کے تمام اساتذہ کرام پروفیسر انیس صدری،

پروفیسر رئیس انور، ڈاکٹر فاراں شکوہ یزدانی اور ڈاکٹر محمد ارشد جمیل وغیرہ نے اس مقالے کی تکمیل میں کسی نہ کسی طرح سے میری مدد کی ہے۔ اس مقالے کے نگراں ڈاکٹر برکت علی ایسوسی ایٹ پروفیسر وصدر شعبۂ اردو، ایم ایل ایس ایم کالج، دربھنگہ نے ہر قدم پر میری رہنمائی کی ہے۔ اگر ان کی رہنمائی اور نیک مشورہ شامل نہ ہوتا تو شاید یہ مقالہ تیار نہ ہو پاتا۔ خدا انہیں صحت وسلامتی عطا فرمائے۔ اس مقالے کی تیاری میں میرے والد محترم عبدالرؤف سابق مکھیا، پنچایت مریٹھا، حلقہ جالے، ضلع دربھنگہ، شروع سے آخر تک میرے ساتھ ساتھ رہے ہیں۔ خدا انہیں ہمیشہ صحت مندر کھے اور لمبی عمر عطا فرمائے۔ اگر والد اور والدہ نے میرے اندر بچپن ہی سے خود اعتمادی پیدا نہ کی ہوتی تو شاید میں یہ کام نہ کر پاتی۔ اپنے شریک حیات محمد شفیع عالم صاحب کا ذکر کرنا ضروری سمجھتی ہوں کیونکہ انہوں نے میرے لیے ایسی فضا پیدا کی جس سے مجھے اس مقالے کو تکمیل تک پہنچانے کا موقع ملا۔ میرے بھائی امتیاز احمد اور اعجاز احمد اور بہن عصمت بانو، نعمت بانو، نکہت بانو، نزہت بانو اور راحت بانو کی نیک دعائیں اس مقالے کو تکمیل تک پہچانے میں شامل رہی ہیں۔ خدا ان لوگوں کو کامیابی و کامرانی عطا فرمائے۔ اپنی بیٹی ادیبہ کے لیے دعا گو ہوں۔ اس کی موجودگی نے میرے اندر اس قدر حوصلہ اور اعتماد پیدا کیا کہ میں اپنے اس ارادے میں کامیاب ہوسکی۔

ڈاکٹر قیام نیّر، صدر شعبہ اردو، این جے مہیلا کالج لہریا سرائے، دربھنگہ نے ضرورت کے مطابق بہت سی کتابیں اور رسائل دستیاب کرائے، ساتھ ہی قدم قدم پر میری رہنمائی بھی کی۔ خدا انہیں کامیابی وکامرانی عطا فرمائے!

آخر میں خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ انہوں نے مجھے اس مشکل، اہم ترین اور صبر آزما کام میں کامیابی عطا فرمائی۔

Farhat Bano
9.05.16
فرحت بانو

باب اوّل

انیسویں صدی میں اردو نثر ۔ایک طائرانہ نظر

Urdu Prose in 19th Century - A bird's eye view

انیسویں صدی میں اردو نثر۔ایک طائرانہ نظر

نثر کا تعلق پورے سماج سے ہوتا ہے اس لئے اس کی تاریخ بے حد پرانی ہے۔ اس کا ارتقا انسانی زندگی اور اس کے تہذیبی و تمدنی ارتقا سے وابستہ رہا ہے۔ زبان چاہے کوئی ہو، بظاہر خیال کی ترسیل کا وسیلہ ہے لیکن یہی وہ چیز ہے جو انسان اور حیوان میں حد امتیاز قائم کرتی ہے۔ یہی انسان کو تمام مخلوقات میں اہم ترین مقام عطا کرتی ہے۔ یہی خیال کی ترسیل کے ساتھ جذبات وافکار اور نفسیاتی کیفیات کے اظہار کا ذریعہ بھی ہے۔ اس لیے انسانی زندگی میں اس کی اہمیت کتنی ہے اس کا اندازہ ہم سب کو ہے۔ اسی کے ذریعہ انسان ایک دوسرے سے رابطہ قائم کرتا ہے۔

افراد کے درمیان یہ رابطہ دو شکلوں میں ہوتا ہے یعنی نثر اور نظم کے ذریعہ۔ گویا زبان اظہار کے دو دائروں پر محیط ہے اور یہ دونوں دائرے ایک دوسرے سے پیوست بھی ہیں اور مختلف بھی۔ نثر کا آہنگ طویل اور پر پیچ ہوتا ہے جبکہ نظم کا آہنگ مختصر ہوتا ہے۔ اس بات کو ڈاکٹر عنوان چشتی نے اس طرح سمجھانے کی کوشش کی ہے:

”....لسانی آہنگ کی بہت سی صورتیں ہیں جو نثر نظم میں ملتی ہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ خالص نثری آہنگ شاعری میں اور خالص شعری آہنگ نثر میں نفوذ کرتا رہا ہے۔ اس لیے خالص عروضی شاعری اور خالص نثر کے درمیان بہت سی صورتیں نظر آتی ہیں۔ مثلاً شعری آہنگ ڈھیلا ہوکر نثری آہنگ کی طرف مائل ہو جاتا ہے تو پابند عروضی شاعری کے بعد معرا نظم، معرا نظم کے بعد آزاد نظم اور آزاد نظم کے بعد نثری نظم آتی ہے۔ اسی طرح نثری آہنگ کی طرف مائل ہوتا ہے تو خالص نثر کے بعد مقفّی نثر، مسجع نثر اور مرجّز نثر آتی ہے اور ان کے بعد ہمہ آہنگ اور شعری نثر آتی ہے۔ اس بات کو ایک نقشہ سے سمجھا جاسکتا ہے۔“

(اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت۔ عنوان چشتی۔ ۱۹۷۰ء، ص:۱۹۹۶ء)

نثر جذبات و خیالات کی ترسیل کا بہتر ذریعہ ہے۔ انسان جو کچھ سوچتا ہے اسے دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ اس کے ذریعہ روزمرہ کے معمولات حل کئے جاتے ہیں۔ علوم وفنون اور فکر و دانش کے چراغ اس کے ذریعہ روشن کئے جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ نثر کا

جادوزندگی کے تمام پہلوؤں اور تمام شعبوں پر چلتا ہے۔نثر بول چال کی عام زبان ہے۔ یہ اظہار گفتگواور تحریر دونوں صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے۔

نثر کی کئی قسمیں ہیں جیسے بول چال کی نثر،علمی نثر اور ادبی نثر۔

اردو نثر انیسویں صدی سے پہلے نثر پارے، بزرگوں کے اقوال، مذہبی رسائل،سفرناموں،لغات،کربل کتھا،سوداؔ کے نثری دیباچہ،تراجم قرآن پاک،تفاسیر،مرز امغل اوران کی تصانیف اورزادآخرت وغیرہ کی صورت میں ملتے ہیں۔

داستانی ادب انیسویں صدی سے قبل کافی ترقی کر چکا تھا۔''قصہ مہر افروز دلبر''،''نوطرز مرصع''،''عجائب القصص''اور''جذب عشق''وغیرہ ایسی داستانیں ہیں جن کی تاریخ بہت قدیم ہے۔کہا جاتا ہے کہ جب سے انسان نے قوت گویائی سے کام لینا شروع کیا اس وقت ہی سے داستان اور انسان کا باہمی تعلق قائم ہوا۔رفتہ رفتہ یہ سماج اور اس کے تمدن کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی رہی اور ایک دن ایسا آیا کہ اس نے باقاعدہ ایک صنف ادب کی حیثیت اختیار کرلی۔اردو میں داستانیں فارسی کی وساطت سے آئیں اور رفتہ رفتہ ہماری تہذیب وتمدن کا حصہ بن گئیں۔ان داستانوں کے بارے میں ڈاکٹر شہناز انجم فرماتی ہیں:

''ان داستانوں کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ فورٹ ولیم سے قبل کی اردو نثر پر گرچہ فارسی اسلوب کا گہرا اثر تھا اور نوطرز مرصع کے بھی بہت سے حصے فارسی انشا کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں مگر رفتہ رفتہ یہ رنگ اترنا شروع ہوا اور عجائب القصص تک آتے آتے داستانی نثر میں کافی دلکشی، نکھار اور سادگی پیدا ہوگئی ___ اور اس نثر میں بیان کی قوت، تازگی نیز سلاست بیان کے وہ عناصر شامل ہوگئے جو ادبی نثر کی تعمیر میں مددگار ہوتے ہیں۔''

(سرسید کی نثری خدمات، ڈاکٹر مشتاق احمد، ص:۱۲۵)

انیسویں صدی کی نثر پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو سب سے پہلے فورٹ ولیم کالج پر ہماری نگاہ جا کر ٹکتی ہے۔ انیسویں صدی کی ابتدا (۱۸۰۰ء) میں یہ کالج کمپنی بہادر کے حکام کو اردو سکھانے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اس کالج کا مقصد اردو کی ترقی اور ترویج و اشاعت نہ تھا بلکہ کمپنی کے انگریز ملازمین کو اردو سکھانے کے مقصد سے یہ کھولا گیا تھا۔ اردو اس وقت سارے ملک کی ابھرتی ہوئی زبان تھی۔ یہ زبان ملک کے ہر حصے میں بولی اور سمجھی

جارہی تھی۔ اس زبان میں تصنیف وتالیف کا کام بھی ہورہا تھا۔ اس لیے اس زبان کو انگریز ملازمین اور افسران بھی سیکھنے اور سمجھنے کے لئے مجبور ہوگئے تھے۔ اس کالج کا قیام چونکہ سرکاری طور پر پہلی بار منظم طریقے سے ہوا تھا اس لئے اس کا اثر اردو نثر کی ترقی ورفتار پر بھی اچھا خاصا پڑا۔ اس کالج کی تاریخ چوّن سالوں تک پھیلی ہوئی ہے لیکن اس میں تصنیفی و تالیفی سرگرمیاں گلکرسٹ کی موجودگی تک قائم رہی۔ کچھ انگریز حکمراں اس کالج کے شروع سے مخالف تھے۔ اس لیے یہ ۱۸۵۴ء میں بند کردیا گیا۔

جان گل کرسٹ نے ملک کے کونے کونے سے نامور اور مشہور ادیبوں اور مصنفوں کو بلاکر اس کالج میں جمع کیا اور بہت ساری کتابیں تصنیف وترجمہ کرائیں۔ انہوں نے نیا ادب تخلیق کرانے کے بجائے موجودہ عربی، فارسی اور سنسکرت کے قصے، کہانیوں کا آسان اردو میں ترجمہ کرایا۔ اتنا ہی نہیں انہوں نے نئے نئے ملازموں کی واقفیت کے لیے تاریخ، جغرافیہ اور قانون کی کتابوں کو بھی اردو میں منتقل کردیا۔ گل کرسٹ کا مقصد ہی یہی تھا کہ عام بول چال کی زبان میں یہاں کی مشہور داستانیں، اخلاقی کہانیاں اور دوسرے موضوعات سے متعلق کتابیں مرتب کرائی جائیں تا کہ ان کے ذریعہ نئے انگریز ملازموں کو یہ زبان سکھائی جائے۔ دوسرے موضوعات پر بھی کچھ

کتابیں ترجمہ کرائی گئیں لیکن داستانوں کا ترجمہ زیادہ ہوا۔ داستانیں تہذیبی، سماجی، مذہبی اور اخلاقی قدروں کی عکاس ہوتی ہیں اور تفریح کا ذریعہ بھی۔ اس لئے اس کالج میں زیادہ تر داستانوں کو ہی عام فہم اور سادہ زبان میں ترجمہ کردیا گیا۔ ڈاکٹر شہناز فاطمہ اس سلسلے میں لکھتی ہیں:

> ''دیگر موضوعات پر کتابیں تالیف و ترجمہ تو ہوئیں مگر یہ حقیقت ہے کہ فورٹ ولیم کالج کی تصانیف میں داستانوں کا پلڑا بھاری ہے۔ کمپنی کے نو وارد ملازمین کو چونکہ زبان کی واقفیت کے ساتھ ہی یہاں کے معاشرتی پہلوؤں اور سماجی رسم و رواج سے بھی واقفیت درکار تھی اس لیے داستانوں کے تراجم پر زیادہ توجہ دی گئی۔ داستانیں تہذیبی و سماجی، مذہبی و اخلاقی قدروں کی عکاس ہوتی ہیں اور تفریح طبع کا ذریعہ بھی ہوتی ہیں۔ اس لیے یہاں بے شمار داستانیں ترجمہ ہوئیں۔ کالج کے ادیبوں اور منشیوں کو باقاعدہ ہدایت تھی کہ وہ سادہ و عام فہم عبارت میں ترجمہ کریں۔ اس لیے تمام تصانیف میں نثر کا ادبی روپ تو نہیں

نکھر پایا ہے مگر سادہ سلیس اسلوب کی روایت کسی قدر آگے
ضرور بڑھی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سادہ نثر نویسی کی
ہدایت کے باوجود بھی ان تصانیف میں کلی طور پر نثر عاری کا
استعمال نہیں ہوا ہے۔''

(ادبی نثر کا ارتقا، ڈاکٹر شہناز انجم، ص:۱۳۱)

انیسویں صدی کی اردو نثر میں ''باغ و بہار'' کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ نثر کا جو شاندار اسلوب اس کتاب میں ملتا ہے وہ اس سے پہلے کی کسی کتاب میں نظر نہیں آتا ہے۔ اس میں تازگی، توانائی اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ ۱۸۰۳ء میں یہ پہلی بار کلکتہ پریس سے شائع ہوئی اس کے بعد اس کے متعدد ایڈیشن نکلتے رہے۔ اس کتاب کے ماخذ کے بارے میں عام طور پر یہ رائے پائی جاتی ہے کہ یہ ''قصہ چہار درویش'' سے ترجمہ کیا گیا ہے لیکن مولوی عبدالحق نے اسے ''نوطرز مرصع'' کا نکھرا ہوا ادبی روپ بتایا ہے۔ اس کتاب کے مترجم میر امن دہلوی کو زبان پر پوری قدرت حاصل تھی۔ وہ یہاں کے میلوں ٹھیلوں، پرب تہواروں، بولی ٹھولی اور کھیل تماشوں سے اچھی طرح واقف تھے اس لیے انہوں نے جو زبان استعمال کی ہے وہ ہندوستانی زبان ہے۔ جس پر دہلی کے روزہ مرہ کی چھاپ گہری

ہے۔

''باغ و بہار'' کی نثر میں تخیل کی بلندی اور فکر کی گہرائی ہے۔ اس کے جملوں میں لطیف آہنگ، الفاظ و معنی کا باہمی ربط اور واقعات کا تسلسل بے حد پرلطف ہے۔ محاوروں کی برجستگی، بول چال کی بے تکلفی اور بے ساختگی بھی اس کے ہر سطر سے آشکارا ہوتی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے بہت حد تک درست فرمایا ہے کہ اس کتاب میں تحریر کی زبان تقریر کے آس پاس آگئی ہے۔

میر امن کو زبان پر اس قدر قدرت حاصل ہے کہ ''باغ و بہار'' میں ترجمہ کی جگہ تخلیق کی شان پیدا ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر شہناز انجم کے مطابق:

> ''مناظر کی عکاسی ہو یا جذبات نگاری، میر امن کا قلم ہر منزل سے رواں دواں گزرتا ہے۔ انہوں نے نثر کے منطقی استدلال اور واقعاتی سچائی کے عنصر کو پوری چابک دستی سے برتا ہے اور قصہ کی تخیلی فضا اور رومانیت کو بھی برقرار رکھا ہے۔ زبان میں سادگی، سلاست اور روانی کے باوجود عمومیت یا پھیکا پن نہیں ہے، میر امن زبان کی سادگی کو پرلطف اور پرکشش بنانے کے

لیے صرف عربی وفارسی کے پرشکوہ الفاظ کا استعمال نہیں کرتے

بلکہ وہ ہندوستان کی بولیوں ٹھولیوں کا پیوند لگا کر عبارت میں

بے ساختگی اور انوکھا پن پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً

''خفگی سے بولی، چہ خوش آپ ہمارے عاشق ہوئے

ہیں، مینڈکی کو بھی زکام ہوا، اے بے وقوف اپنے حوصلے سے

زیادہ باتیں بنانا خیال خام ہے، چھوٹا منہ بڑی بات، بس چپ

رہ یہ نکمی بات چیت مت کر۔ اگر کسی اور نے یہ حرکت بے معنی

کی ہوتی پروردگار کی سوں اس کی بوٹیاں کو اچیلوں کو بانٹتی، پر کیا

کروں تیری خدمت یاد آتی ہے اب اس میں بھلائی ہے کہ اپنی

راہ لے، تیری قسمت کا دانا پانی ہماری سرکار میں یہیں تک تھا۔''

(ادبی نثر کا ارتقا، ڈاکٹر شہناز انجم، ص: ۱۳۴)

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''باغ و بہار'' کی نثر ہندوستانی معاشرت کی

عکاسی اور تہذیبی وتمدنی روایات کی آئینہ دار ہے۔ اس کے کردار یمن کے شہزادے ہوں یا

فارس وعجم اور بصرہ کی شہزادیاں، ان کے طور طریقوں، رسم ورواج، لباس اور عادت واطوار

سب ہندوستانی ہیں۔ مولوی عبدالحق نے کیا خوب کہا ہے:

''اردو کی پرانی کتابوں میں کوئی کتاب زبان کی فصاحت اور سلاست کے لحاظ سے اس سے لگا نہیں کھاتی۔''

(مقدمہ باغ و بہار۔ مولوی عبدالحق، ص: ۱۵)

انیسویں صدی میں حیدر بخش حیدری کی کئی کتابیں (ترجمہ شدہ) منظر عام پر آئیں لیکن ان میں ''طوطا کہانی'' کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ ''قصہ مہر وماں''، ''قصہ لیلیٰ مجنوں''، ''آرائش محفل'' اور ''قصہ حاتم طائی'' وغیرہ حیدری کی اہم ترین کتابیں ہیں۔ ۱۸۰۱ء میں لکھی گئی ''طوطا کی کہانی'' ۱۸۰۴ء میں شائع ہوئی۔ یہ محمد بخش قادری کے ''طوطی نامہ'' سے ترجمہ کی گئی ہے۔ ۲۷ صفحات پر پھیلی ہوئی اس کتاب میں ۳۸ داستانیں شامل ہیں۔ یہ تمام داستانیں ایک طوطا اپنی مالکن خجستہ کو سناتا ہے۔ دراصل یہ ایک نصیحت آموز داستان ہے جو سلیس اور سادہ زبان میں لکھی گئی ہے۔ ہر حکایت کے آخر میں اشعار کا استعمال کیا گیا ہے۔ درمیان میں بھی اشعار مل جاتے ہیں مگر اس کے ساتھ بیان کی سلاست اور روانی بھی قائم رہتی ہے۔ ''باغ و بہار'' کی طرح سادہ اور لطیف نثر تو اس میں نہیں ہے لیکن مانوس الفاظ اور جملوں کے ربط سے بیان میں لوچ پیدا ہو گیا ہے۔ اس کہانی

کی نثر میں ایسی بے تکلفی پائی جاتی ہے جو اس وقت کی کتابوں میں نہیں دیکھی جاتی۔ زبان کی تازگی اور تشبیہات کی ندرت کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

''کسی وقت میں رائے بابل کا بیٹا ایک بت خانے میں پوجا کرنے گیا ___ وہاں ایک لڑکی کو دیکھا کہ وہ نہایت خوبصورت تھی کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ عجب حسن اسے خدا نے دیا تھا۔ سبحان اللہ چودھویں رات کا چاند اس کے مکھڑے سے شرمائے اور سیاہی اس کی زلف کی رات کو آٹھ آٹھ آنسو رلائے۔ قد اس کا اگر سرو دیکھ تو مارے خجالت کے زمیں گڑ جائے۔ اور کبک اس کی رفتار کو نہ پائے۔''

(طوطا کہانی)

اس کتاب کا مقصد اصلاحی ہے مگر حیدر بخش حیدری نے داستانی رنگ پر مقصدیت کو غالب نہیں ہونے دیا ہے۔ یہ کتاب اس دور کی ادبی نثر کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ ''داستان امیر حمزہ'' اردو کی ایک اہم داستان ہے۔ اسے اردو میں پہلی بار

خلیل علی خاں اشکؔ نے پیش کیا ہے۔ ۱۸۰۳ء میں کلکتہ پریس سے یہ شائع ہوئی ہے۔ یہ داستان شگفتہ اور لطیف عبارات کی حامل ہے۔ اس کی سلاست اور عام فہمی دیکھ کر اشک کی زبان دانی اور فنی مہارت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ''داستان امیر حمزہ'' اردو نثر کے کلاسیکی ادب کا سرمایہ ہے۔ بیرون دلی کی مختلف بولیوں کی آمیزش سے اردو نثر کے دامن کو وسیع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً

> ''جب حمزہ نے اردق چینی کے مارنے سے فراغت اور فرصت حاصل کی اور دوسرے موذیوں کو بھی پردۂ فنا میں چھپایا اور آگے بڑھے تو ایک ساعت میں ایک باغ دیکھا جس کا نام ارم تھا۔ بس حمزہ وہاں گئے اور ہتھیاروں کو بدن سے جدا کر کے جسم کو دھویا اور گرد وغبار کو دور کیا تو صورت امیر کی ایسی ہوگئی جیسی بدلی سے چاند نکل آتا ہے۔ تب ایک گورخر کو مار کر کباب بنایا اور کھا کر رازق مطلق کا شکرانہ ادا کیا۔ اور وہاں ایک محل بلند دیکھ کر تصور کیا کہ البتہ یہاں کوئی آدمی رہتا ہوگا۔''

(داستان امیر حمزہ، ص: ۲۳۱)

اس عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کتاب کا انداز بیان سلیس ہی نہیں رواں دواں اور شگفتہ ہے۔ اس کی نثر میں طول بیان اور طویل جملوں کی جگہ اختصار اور جامعیت ہے۔ قصہ کو سادہ اور فطری انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

فورٹ ولیم کالج میں جن کتابوں کا ترجمہ ہوا ان میں ''شکنتلا ناٹک'' جو کالی داس کے مشہور ڈراما 'سکونتولا'' کا ترجمہ ہے، بے حد مقبول ہو چکی ہے۔ اسے پہلی بار مرزا کاظم علی جوان نے ترجمہ کیا تھا۔ اس میں قافیوں کے ذریعہ عبارت میں زور اور ترنم پیدا کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی نثر میں ہندی انشا پردازی کا رنگ اردو انشا پردازی سے ہم آہنگ ہو گیا ہے جو اردو نثر میں ایک خوبصورت اور گراں قدر اضافہ ہے۔

''بیتال پچیسی'' کی اہمیت ادبی نثر کے ارتقائی سفر میں کافی ہے۔ مظہر علی خاں ولاؔ نے للولال جی کے اشتراک سے ترجمہ کیا ہے۔ اس میں اس عہد کے سیاسی اور سماجی حالات، زر، زمین کے لیے ہونے والے قتل وخون کے واقعات اور عورتوں کے چھل کپٹ کی داستانیں بیان کی گئی ہیں۔ اس میں شامل اخلاق آموز کہانیاں بہت خوبصورت اور فنکارانہ حسن کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ واقعات کے بیان اور مناظر کی عکاسی میں اثر

آفرینی اور انشاپردازی کا کمال ہر جگہ نظر آتا ہے۔ مثلاً:

''اور اس کے بیچ ایک سندر تالاب دیکھا کہ اس کے کنارے ہنس، چکوا چکوی، بگولے، مرغابیاں سب کے سب کلول میں تھے۔ چاروں طرف پختہ گھاٹ بنے ہوئے، کنول تالاب میں پھولے ہوئے، کناروں پر طرح طرح کے درخت لگے ہوئے کہ جس کی گھنی گھنی چھاؤں میں ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں اور پنچھی پکھیرو درختوں پر چہچہوں میں تھے اور رنگ برنگ کے پھول بن میں پھول رہے تھے۔ ان پر بھنوروں کے جھنڈ کے جھنڈ گونج رہے، کہ یہ اس تالاب کے کنارے پہنچے اور ہاتھ منہ دھو کر اوپر آئے۔''

(بیتال پچیسی مرتبہ گوہر نوشاہی، ۱۹۶۵ء، مطبع مجلس ترقی ادب، لاہور، ص:۱۶)

مختصر یہ کہ بیتال پچیسی ہندی آمیز اردو کا ایک حسین مرقعہ ہے۔ اس سے اردو نثر کی ادبی روایت کو قوت اور تازگی ملی ہے۔

''نثر بے نظیر'' میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان'' کا قصہ ہے۔ اسے میر بہادر علی

حسینی نے اردو نثر میں منتقل کیا ہے۔زبان و بیان کے لحاظ سے یہ کتاب کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔

فورٹ ولیم کالج میں جو اہم کتابوں سے ترجمے ہوئے ان میں ''مذہب عشق'' ،''قصہ سیف الملوک''، ''قصہ گل صنوبر''، ''گلزار دانش''، ''حسن و عشق''، ''سنگھاسن بتیسی''، ''قصہ فیروز شاہ'' اور ''قصہ دل وحسن'' وغیرہ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔انیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں اس کالج میں جتنی کتابوں کے ترجمے ہوئے ان میں سے زیادہ تر اپنے صاف اور پر کشش اسلوب اور معیاری انداز بیان کی بدولت مشہور ہوئیں۔ اس کالج میں دوسری زبانوں سے جتنی کتابیں ترجمہ ہوئیں ان میں داستانوں کا حصہ زیادہ ہے۔ان میں سے کچھ کتابیں براہ راست برج بھاشا سے اردو میں آئیں اور زیادہ تر کتابیں عربی اور فارسی سے اردو میں منتقل ہوئیں۔اس سلسلے میں شہناز انجم فرماتی ہیں:

> ''اس دور میں کالج کے دائرۂ عمل میں جو نثر وجود میں آئی وہ کئی مشترکہ خصوصیات کی حامل نظر آتی ہے۔مثلاً فورٹ ولیم کالج کے دائرۂ عمل میں پنپنے والی اس نثر میں برج بھاشا کے اثرات بھی شامل ہوئے، ہندی اسلوب کی بے ساختگی و بے تکلفی بھی

داخل ہوئی اور عربی و فارسی اسالیب کی عظمت و شیرینی بھی گھلی ملی نظر آتی ہے۔ چنانچہ ان سب کے آمیزہ سے ایک نیا اسلوب ابھر کر سامنے آیا جس میں سادگی رنگینی سے، رومانیت حقیقت پسندی سے اور تخیل پرستی زندگی کی حقیقتوں سے دوچار نظر آتی ہے۔"

(ادبی نثر کا ارتقا، ڈاکٹر شہناز انجم، ص:۱۹۰)

اس دور کی کتابوں میں سادگی کے ساتھ ساتھ تشبیہات اور استعاروں کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ قافیہ پیمائی اور فارسی تراکیب بھی ملتے ہیں لیکن ان کتابوں کی نثر میں روزمرہ محاوروں کی نغمگی اور جملوں کی بے ساختگی بھی پائی جاتی ہے۔ منظر نگاری، جذبات نگاری اور واقعہ نگاری کے وصف سے بھی اس دور کی اردو نثر بھری پڑی ہے۔ ان کتابوں میں ہماری معاشرت اور تہذیب کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ ان میں ہمارے بگڑے ہوئے اور کمزور معاشرہ پر اظہار افسوس بھی کیا گیا ہے اور اپنی تہذیب و معاشرت پر فخر کا اظہار بھی کیا گیا ہے جو ہمارے ورثہ میں ملا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین اور مؤلفین نے

وقت کی ضرورتوں کی مناسبت سے روایت کی پاسداری بھی کی ہے اور حالات کے تقاضوں کے مدنظر عمدہ توازن قائم کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کی سلاست نگاری اور سادہ بیانی نے ہندوستان کے مختلف علاقوں کی اردو نثر کو بھی متاثر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کالج سے الگ بھی عام فہم زبان کا استعمال ہونے لگا۔ اتنی بات ضرور ہے کہ اس دور میں سماجی قدریں تیزی سے تبدیل ہو رہی تھیں۔ ایک طرف نئی قوموں کی آمد نے سماج اور معاشرے پر اثر ڈالا تھا تو دوسری طرف نئی تہذیب، نئے تمدن اور جدید تعلیم نے بھی ہمارے ادب پر اثر ڈالا تھا۔ مغربی نظریات بھی رفتہ رفتہ اپنے قدم جمانے لگے تھے۔ جاگیردارانہ نظام اور مغلیہ تہذیب و تمدن جدید دور سے ہم آہنگ ہو رہے تھے۔ قدیم و جدید کی کشمکش شروع ہو چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو نثر بول چال کے لئے تو پورے طور سے رائج ہو چکی تھی لیکن تحریر میں پوری طرح یہ رائج نہیں ہوا تھا۔ عربی و فارسی اسلوب کی جھلک موجود تھی۔ کہیں زبان میں سادگی تھی تو کہیں تکلف و تصنع اور کہیں دونوں اسالیب کی ہم آہنگی۔

انیسویں صدی کے وسط تک فورٹ ولیم کالج سے باہر بہت سی داستانیں لکھی جا چکی تھیں۔ ان میں ''رانی کیتکی''، ''گلشن نو بہار''، ''نورتن''، فسانۂ عجائب''، ''باغ

عشق''، ''قصہ گل صنوبر''، ''قسہ بہرام گور'' قصہ الف لیلیٰ''، ''بہار عشق'' اور ''بوستان خیال'' وغیرہ کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔

اسی طرح انیسویں صدی کا نصف دور واقعتاً داستان نویسی کا دور رہا ہے۔ فورٹ ولیم کالج میں تقریباً سبھی داستانیں تراجم پر مبنی تھیں۔ مگر باہر کے نثری ادب میں طبع زاد داستانیں بھی وجود میں آرہی تھیں۔ اس دور میں داستان نویسی کا ایک خاص رجحان اور مزاج ملتا ہے جو مشکل پسندی سے بتدریج سادگی اور سلاست کی طرف سفر کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ سنسکرت، ہندی، فارسی، عربی اور ہندوستانی زبانوں کی آویزش سے اردو نثر بھی متاثر ہوئی۔ اس دور میں ''فسانۂ عجائب'' کو خاص مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسے لکھنوی اسلوب کے عہد بہ عہد ارتقا کا نمونہ کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس خطی نسخہ اور دوسرے نسخوں کے اسلوب میں فرق ہے۔ مثلاً:

> ''وہ چودھویں شب تھی۔ ملکہ نے سامان چاندنی دیکھنے کا کیا تھا۔ وہاں شہزادے کو بٹھایا۔ کشتیاں شراب ارغوانی و زعفرانی کی لے کر ساقیان سیمیں ساق بعتبان شہرۂ آفاق حاضر ہوئے، ادھر دور جام وسبو، ادھر مطربان خوش گلو، لگے گانے، ملکہ نے

گلاس شراب سے بھر کر اٹھایا شہزادے سے کہا۔‘‘

(فسانۂ عجائب کا بنیادی متن، ص:۷۹)

اس بیان کو بعد کے مطبوعہ نسخہ میں اس طرح پیش کیا گیا ہے:

’’چودھویں رات، ابر کھلا آسمان، صاف شفاف ماہ سامان اس تکلف کا۔ برسات کی چاندنی سبحان اللہ، فواروں کے خزانے میں بادلہ کٹا پڑا۔ ہزارے کا فوارہ چڑھا۔ پانی کے ساتھ بادلہ کی چمک، ہوا میں پھولوں کی مہک، فوارے نے زمین کو ہمسر آسمان بنایا تھا۔ ستاروں کے بدلے بادلے کے تاروں کو بچھایا تھا۔ بڑی چمک، دمک سے ملکہ کے مکان پر چاندنی دیکھنے کا سامان تھا۔ شہزادے کے آنے کا کسے گمان تھا۔ غرض کہ جان عالم کو لے جا شامیانے تلے مسند مغرق پر بٹھایا۔‘‘

(فسانۂ عجائب، ۱۹۶۴ء، مطبع منشی تیج کمار، لکھنؤ، ص:۴۸)

فورٹ ولیم کالج سے باہر لکھی گئی داستانوں میں عام طور پر اسلوب کے دو رجحانات ملتے ہیں۔ ایک سادگی وسچائی اور واقعاتی کیفیتوں کا غماز ہے تو دوسرا رنگینی،

تکلف اور شادابی کا حامل ہے۔ اس میں قافیہ پیمائی اور محاوروں کی سجاوٹ دور ہی سے دیکھی جاسکتی ہے۔ ان دونوں رجحانات کی آمیزش سے اس دور کے داستانوں میں سلاست، رافعت اور ادبیت پیدا ہوگئی ہے۔ اس دور کی اردو نثر کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے فورٹ ولیم کالج کے اندر اور اس کالج سے باہر لکھی گئی داستانوں کا مطالعہ ضروری ہے۔

انیسویں صدی کی نثر کو سمجھنے کے لئے اس دور میں لکھے گئے خطوط کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اردو زبان میں خطوط نویسی کی ابتدا مرزا غالبؔ سے ہوئی۔ لیکن ان سے پہلے بھی اکادکا خطوط لکھے گئے اور شائع کئے گئے۔ ۱۸۲۲ء کو اردو خطوط نویسی کی روایت کا سنہ آغاز قرار دیا جاتا ہے۔ خواجہ احمد فاروقی کے حوالے سے جو خط نقل کیا گیا ہے اس کے لکھنے والے نواب شکوہ الملک ثانی نصیر الدولہ دلیر جنگ ہیں اور مکتوب الیہ ان کی لڑکی نواب بیگم ہیں۔

"نور چشمی راحت جان سعادت مند دو جہاں گل سرسبز دودمان شرف بخشی خاندان۔ اس دعا کا عمل میرے تئیں حضرت چچا صاحب قبلہ سے جو عنایت ہوا اور دعا کو دو کاغذ کے اوپر لکھوا کر بھیجا ہوں۔ ایک تمہارے واسطے اور ایک نواب عظیم جاہ کے

واسطے۔ باراول وآخر درود صبح شام کو ایک ایک دفعہ پڑھنا زیادہ

عمرودولت زیادہ ہوئے۔"

(دور قدیم کے اردو خطوط پر ایک نظر، ص:۳)

انیسویں صدی کے اول تک اردو عام لوگوں کے ساتھ ساتھ خواص کے یہاں بھی استعمال ہونے لگی تھی۔ اس لیے مکتوب نگاری کی طرف بھی توجہ دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی کے مشہور ادباء اور شعراء بھی اردو لکھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ مفتی صدرالدین آزردہ فارسی کے عالم ایک بڑے شاعر تھے اور انشا پرداز بھی تھے۔ اردو کی مقبولیت دیکھ کر وہ بھی اس طرف متوجہ ہو گئے۔ انہوں نے کچھ دوستوں کو خطوط لکھے۔ ان میں سے ایک خط کے عبارت کی نقل خواجہ احمد فاروقی کے حوالے سے کی جاتی ہے:

"شکر ہے اس پروردگار عالم کا جس نے مجھ کو ایسی دلدل سے کہ ہمہ تن اس میں غرقاب تھا نکالا، کیسے علائق میں جکڑ بند تھا کہ نکلا، اس سے سوائے ایسی صورت کے جو پیش آئی ممکن نہ تھا ـــــ رات دن اسی میں غلطاں پیچاں تھا اور جان کو اک دم آرام نہ تھا۔ نہ کھانے کی حلاوت نہ سونے کا مزہ، نہ طاعت کا

لطف۔"

(ذوق و جستجو۔ ادارۂ فروغ اردو، لکھنو، ۱۹۶۷ء، ص: ۱۳۶)

پہلی جنگ آزادی تک رجب بیگ علی سرورؔ، غلام غوث بے خبر اور واجد علی شاہ وغیرہ نے اپنے خطوط کے ذریعہ اردو نثر کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ ان لوگوں نے انسانی جذبات اور مختلف موضوعات کی وضاحت کے لئے نئے نئے اسالیب تلاش کیے۔ ان ادیبوں کے خطوط کے ذریعہ ایک طرف مکتوب نگاری کی روایت کو آگے بڑھنے کا موقع ملا تو دوسری طرف اردو نثر کو بھی بڑھاوا ملا۔ اس زمانے میں دو طرح کے اسالیب رائج تھے ایک پرانی قدروں کا امین تھا جس میں فارسی زبان کی جاہ وحشمت اور درباری تکلفات تھے ساتھ ہی مسجع و مقفیٰ عبارتیں تھیں۔ دوسرا جدید اسلوب تھا جو سادہ اور معیاری تھا۔ مانوس اردو الفاظ اور سادہ ترکیبیں تھیں۔

انیسویں صدی میں (۱۸۵۷ء تک) رجب علی بیگ سرور غلام غوث، بے خبر واجد علی شاہ کے نام خطوط نگاری میں لئے جا سکتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے خطوط کے ذریعہ اردو نثر کو آگے بڑھانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ اس دور کے اردو نثر کے ارتقا کا سراغ ان لوگوں کے خطوط سے ملتا ہے۔ ان لوگوں نے اردو نثر کو ایک نئی روح عطا کی۔

خواجہ غلام غوث بے خبر فارسی کے ایک اچھے شاعر تھے مگر اردو کی بھی اچھی پکڑ رکھتے تھے۔ ''انشائیے بے خبر'' کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ ان کے خطوط کا مجموعہ بھی ۱۹۶۰ء میں مرتضیٰ حسین بلگرامی نے اسی نام سے شائع کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں سبک اور سادہ الفاظ بھی ہیں مگر جملوں کی طوالت کی وجہ سے ان کی نثر بوجھل ہوگئی ہے۔ مثلاً غلام دستگیر کے نام ایک خط کی ابتدا انہوں نے اس طرح کی ہے:

''اللہ اللہ ایسے ناپرسی اور ناقدری کے زمانے میں کہ آفتاب کو ذرہ، دریا کو قطرہ، گل کو خار، اکسیر کو خاک، جواہرات کو پتھر، موتی کو سیپ، سونے کو تانبا، چاندی کو پارہ، چاند کو تارا کے برابر بھی لوگ نہیں جانتے ایسے جوہر شناس اور قدرداں بھی ہیں جو ذرہ کو آفتاب، قطرہ کو دریا، خار کو گل، خاک کو اکسیر، پتھر کو جواہرات، سیپ کو گوہر، تانبا کو سونا، پارہ کو چاندی، تارہ کو چاند کے مساوی مانتے ہیں۔ سچ ہے ایسے ہی لوگوں سے یہ زمانہ قائم ہے۔ آپ میری اور میری تصنیف کی تعریف فرماتے ہیں۔ اور میں خجالت سے پانی پانی ہوا جاتا ہوں، حیرت کے دریا میں ڈوبا

جاتا ہوں۔''

(انشائیے بے خبر، مرتبہ مرتضٰی حسین بلگرامی، ادبی دنیا، علی گڑھ، ۱۹۶۰ء، ص:۱۲)

واجد علی شاہ کی مکتوب نگاری انیسویں صدی کی تاریخ ادب اردو میں اہم مقام رکھتی ہے۔ خواجہ احمد فاروقی نے ان کے کئی خطوط کا تذکرہ کیا ہے۔ ان خطوط کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں عبارت سادہ اور عام فہم ہے۔ الفاظ مانوس اور انداز بیاں دل گداز ہے۔ واجد علی شاہ اور شیدا محل کے ایک ایک خط کی نقل یہاں پیش کی جارہی ہے۔ اس میں قافیوں کی تکرار کے باوجود عبارت میں قدرے سادگی ہے:

''صبا بھی ہم قیدیوں کی پیغامبری نہیں کرتی، ہر طرف پہرا ہے، ہر طرف یاس ہے، دو رفیق ہیں ایک خوف دوسرا ہراس۔ ایک قید خانے میں ہم پڑے ہوئے ہیں چاروں طرف حراست ہے، ہمارے ساتھ اٹھارہ آدمی مصیبت جھیل رہے ہیں، ہر ایک اپنے جینے سے بیزار ہے۔ قید غم میں گرفتار ہے۔''

(بیگمات اودھ کے خطوط، ص:۴۸)

عبارت سادہ اور عام فہم ہے۔ الفاظ مانوس اور انداز بیان دل گداز ہے اس

میں ایک ایسے شخص کے احساسات کی سچی تصویر ملتی ہے جو قید کی مصیبتوں کے ساتھ دوری و مہجوری کی جان گسل کیفیت سے بھی دوچار ہے۔نواب شیدا محل ایک خط میں اپنی حالت اس طرح بیان کرتی ہیں:

''سچ کہو تمہیں خدا کی قسم کیوں ہو گئے ہم سے برہم، ہم کو اس کا
بہت ہے غم، کس نے الفت کی ہے کم، اپنا فرقت سے نکلتا ہے
دم، دم کو کچھ نہیں اس کا رنج والم، میں دعا یہ کرتی ہوں ہر دم کہ
خیریت سے لائے تم کو رب اکرم، پھر ہم تو ہوں باہم اور نور چشم
نگیں ادا بیگم تسلیم کرتی ہیں ہو کر خم۔'' (اسرار سلطانی، س:۹)

(بحوالہ ادبی نثر کا ارتقا، ڈاکٹر شہناز انجم، ص:۱۹۲)

مرزا غالبؔ کو اردو نثر کا مسیحا مانا جاتا ہے۔انہوں نے اردو نثر کو نئی سمتوں اور نئی جہتوں سے روشناس کرایا ہے۔ان کے بارے میں حالؔی نے کہا کہ سرسید سے قبل اگر کوئی نثر وقعت اور لائق پیروی ہے تو مرزا کی نثر ہے۔اسی طرح خواجہ احمد فاروقی کہتے ہیں کہ مرزا غالبؔ نے اردو شاعری ہی کو نیا رنگ و آہنگ نہیں دیا، جدید اردو نثر کی بنیاد بھی اپنے بابرکت ہاتھوں سے قائم کی۔

مرزا غالب کے خطوط کے کئی مجموعے مثلاً ''عود ہندی'' ۱۸۶۸ء، ''اردوئے معلّٰی'' اول ۱۸۶۹ء حصہ دوم ۱۸۹۹ء ''مکاتیب غالب'' اور ''نادرات غالب'' وغیرہ۔ ان کے خطوط نے نہ صرف مکتوب نگاری کے فن کو آگے بڑھایا بلکہ اردو نثر کو بھی آگے بڑھانے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ خطوط میں ان کی نثر اپنے اونچے معیار کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہے:

''منشی صاحب تمہارا خط اس دن یعنی بدھ کے دن پہنچا کہ میں
چار دن سے لرزہ میں مبتلا ہوں۔ مزہ یہ ہے کہ جس دن سے
لرزہ چڑھا ہے کھانا میں نے مطلق نہیں کھایا''

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مکتوبات نے اردو کی ادبی نثر کو ایک نئی زندگی بخشی اور اسے آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا۔

انیسویں صدی میں اردو صحافت نے بھی اردو نثر کو آگے بڑھانے اور اسے عوام کے قریب تر کرنے میں ایک اہم کردار نبھایا ہے۔ فارسی کے بعد اردو میں صحافت کا آغاز ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ادب کی ایک مستقل صنف کی حیثیت اختیار کر لی۔ اردو اخبار نے نہ صرف خبروں کی ترسیل کا کام انجام دیا بلکہ زبان وادب کی اشاعت اور تہذیب وتمدن کی ترویج و اشاعت میں بھی حصہ لیا ہے۔

اب تک کی تحقیقات کے مطابق اردو کے صحافت کا آغاز ''جام جہاں نما'' سے ۱۸۲۲ء میں ہوا لیکن صحیح معنوں میں صحافت کی ترقی ۱۸۳۶ء کے بعد شروع ہوئی جب اردو کو سرکاری زبان کا درجہ ملا۔

''جام جہاں نما'' کے بعد اردو میں جو اخبار نکلے اور اردو نثر کو آگے بڑھانے میں اچھی کارکردگی کا نمونہ پیش کیا ان میں ''دہلی اردو اخبار''مظہر حق''، ''سید الاخبار''، ''قرآن اسعدین''، ''فوائد الشائقین''، ''بنارس گزٹ''، ''اسعد الاخبار آگرہ''، ''جام جمشید''،فوائد الناظرین''، ''محبّ ہند''، ''کوہ نور''، ''دریائے نور''، ''ریاض نور''، ''گوالیار گزٹ''، ''طلسم''،سحر سازی''، ''صادق الاخبار''اور''اخبار الظفر''وغیرہ خاص ہیں۔اس اخباروں کے علاوہ الگ الگ ریاستوں سے بھی بہت سے اخبار نکلتے تھے۔ان اخبارات سے اردو نثر کے سفر کے ارتقا کو دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔صحافتی اسلوب کا رنگ کس حد تک ادبی تھی اس کا اندازہ ان اخبارات سے لگایا جا سکتا ہے:

> ''باہر سے آیئے تو آپ کو دور سے یہ معلوم ہوگا کہ تمام دنیا کی روشنی اکٹھا ہو کر ایک بقعہ نور بن گیا ہے۔امام باڑے میں داخل ہونے کے وقت کنویں کے پاس دو سبیلیں ملتی ہیں جن کے بیچ

میں بجلی کی روشنی کا کھمبا گڑا ہوا ہے اس میں ایک بیضاوی

فانوس ہے یہاں سے چل کر امام باڑے تک دوطرفہ آراستہ

بازار ملتا ہے۔"

(تاریخ صحافت اردو، جلد اول، ص: ۴۴۷)

"شاخِ قلم خوشی سے پھولی جاتی ہے کہ مالی کی دکان کی تازہ

کیفیت زبان پر آتی ہے۔ ہر قسم کے رنگین اور خوشبو دار پھول

اور پھلوں کے ہار گجرے اور دستنبوے اور گلدستے ٹوکروں اور

طشتریوں میں مہک رہے ہیں۔ خریدار یعنی گراہک دکان پر

کھڑے ہوئے بلبل کی طرح چہک رہے ہیں۔"

(گوالیار گزٹ، بحوالہ تاریخ صحافت اردو، ص: ۴۴۸)

اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دئے جانے کے بعد اردو کا پہلا اخبار "دہلی اردو اخبار" نکلا جو بعد میں "اخبار الظفر" ہوگیا۔ اس اخبار نے اردو صحافت کی دنیا میں بیداری اور حرکت پیدا کردی۔ زبان و بیان کے لحاظ سے اس کی زبان پر تکلف ہے اور فارسی زبان کا اثر چڑھا ہوا ہے۔ لیکن ان کی خبروں میں صرف عبارت آرائی نہیں بلکہ مقصد اور مفہوم کا

ترسیل کا پہلو نمایاں ہے۔ مثلاً:

''ان دنوں اس شہر میں ایک حادثہ عظیم واقع ہوا کہ دیکھنے اس کے سے پتا آدمیوں کا پانی ہو گیا ہے یعنی ایک روز وقت بارش باران رحمت الٰہی یکا یک رعد خروش میں آیا اور بجلی باروت خانے میں سرکاری کمپنی کی پڑی، ایک دم میں شعلہ عالم سوز نے سر بفلک کھینچا اور باروت خانے کو یک بارگی بیخ و بن سے اوکھاڑ کے ایسا ہوا میں پھینکا کہ سنگ وخشت اوسکی سے کچھ نظر نہ آیا، صدمہ اوس کے سے صدہا مکان رفیع الشان قرب وجوار باروت خانے کے جڑ سے اوکھڑ کے گر پڑے اور تمام شہر میں زلزلہ عظیم پیدا ہوا، مگر باوجود اس قدر شکست و ریخت درو دیواروں کے کسی شخص کو صدمہ اس قدر نہ پہنچا کہ جان سے مرجاوے لیکن اکثر آدمیوں کو زخم پہنچے اور اچھے ہو سکتے ہیں۔''

(مقدمہ دہلی اردو اخبار بحوالہ ادبی نثر کا ارتقاء ص: ۳۲۴)

مختصر یہ کہ ان اخبارات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انیسویں صدی میں

نئے دور کی آمد اور حالات کی تبدیلی نے عربی اور فارسی کے اثرات کو ماند کردیا اور تصنع و تکلف کا رنگ بھی بہت حد تک غائب ہوگیا۔ اس دور کی اردو نثر میں بہت سے جدید رجحانات مثلاً علمی، سائنسی اور سیاسی اسلوب وغیرہ بھی نظر آتے ہیں۔

انیسویں صدی میں محمد حسین آزاد کے ''آب حیات'' اور ''نیرنگ خیال'' کے خوب چرچے رہے۔ آج تک یہ کتابیں بڑی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ اس وقت یا ان سے پہلے مقطع و مسجع نثر عام تھی۔ محمد حسین نے اسے آسان اور عام فہم کرنے کی کوشش کی اور بہت حد تک کامیاب رہے۔ ڈاکٹر وہاب اشرفی فرماتے ہیں:

> ''ان کے اسلوب کی دلکشی، ان کی ذہانت، طبیعت کی لطافت کا ہر جگہ احساس ہوتا ہے۔ کہیں کہیں استعارہ کا استعمال تو کہیں تخاطب کا نیا انداز اختیار کیا ہے۔ کہیں نازک خیالی اس طرح پیش کی گئی ہے کہ شاید و باید کہیں مثالوں کی وہ کیفیت سامنے لائی گئی ہے جو دوسری جگہ ملتی ہے۔ کہیں محاکات سے کام لیا ہے تو کہیں صنائع بدائع کا برمحل استعمال ہے۔''

(تاریخ ادب اردو۔ ڈاکٹر وہاب اشرفی، ص:۴۹۹)

ڈپٹی نذیر احمد اصلاحی ناول نگاری کے لیے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ان کے ناولوں کے اثرات دور رس رہے۔ان کے ناول نے ہر علاقے میں اصلاحی لہریں پھیلا دیں۔نتیجے کے طور پر اصلاحی تحریریں بھی سامنے آنے لگیں۔''صورت الخیال'' شاد عظیم آبادی ''اصلاح النسا''، ''رشیدۃ النسا''، ''فسانہ خورشیدی''،افضل حسین عظیم آبادی اور ''محل خانہ'' سجاد عظیم آبادی وغیرہ ایسے ہی ناول ہیں۔ڈپٹی نذیر احمد کی نثر نے انیسویں صدی کی نثر میں اپنی گہری چھاپ چھوڑی ہے۔اس کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے جو ان کے ناول ''رویائے صادقہ'' ۱۸۹۴ء سے ہے جو خط کی صورت میں ہے۔اس کا اختصار اس طرح ہے:

> ''ایک دن صادقہ کے والد کو ایک خط موصول ہوتا ہے۔یہ خط کیا ہے پوری کتاب ہے۔علی گڑھ کے ایک طالب علم صادق نے صادقہ سے رشتے کے لئے پیام دیا ہے اور ساتھ ہی اپنے مذہبی عقائد تفصیل سے بیان کر دیئے ہیں۔اندازہ ہوتا ہے کہ جدید تعلیم نے اس کے مذہبی عقائد کو متزلزل کر دیا ہے۔کالج کی تعلیم سے مذہب کو خطرے ہو سکتے تھے۔اس خط کے پردے

میں اس کا بیان ہو گیا ہے۔ بہر حال لڑکی کے والدین کو یہ رشتہ

قبول کرنے میں تامل تھا۔لیکن صادقہ اپنی سہیلی کے ذریعہ ماں

باپ سے کہلواتی ہے کہ اس نے خواب میں دیکھا ہے کہ یہ رشتہ

ہو کے رہے گا۔انجام کار شادی ہو جاتی ہے۔"

(نذیر احمد، نورالحسن نقوی، ص:۴۸)

الطاف حسین حالی کا نام کئی حیثیتوں سے اردو ادب کی تاریخ میں نمایاں ہے۔

وہ ایک عظیم شاعر، ایک بڑے سوانح نگار اور ایک معتبر نقاد تھے۔ جب ان کی نثر پر نظر ڈالتے

ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا کینوس بہت بڑا ہے۔ انہوں نے مولود شریف اور مناظرے

پر مبنی کئی دوسری کتابیں لکھیں۔ سوانح نگاری میں "یادگار غالب"، "حیات سعدی"، "حیات

جاوید" اور تنقید میں "مقدمہ شعر و شاعری" لکھی۔ ان کے یہاں ایک اسلامی تیور موجود ہے

لیکن نثر کے جو مطالبات ہوتے ہیں ان سے یہ عاری نہیں ہیں۔ انہوں نے سرسید کے

"تہذیب الاخلاق" میں بہت سے اصلاحی مضامین لکھے۔ ظاہر ہے سرسید آسان اور عام

فہم نثر کو عام کرنا چاہتے تھے اس لئے حالی نے بھی اس طرح قدم بڑھایا ہے۔

انیسویں صدی میں نواب محسن الملک، عبدالمجید سالک، وقار الملک، مولوی

چراغ علی، امداد امام اثر، وحید الدین سلیم، عبدالقادر سروری اور مہدی افادی وغیرہ کی تخلیقات پر نظر ڈالنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے چاہے جس صنف کو اپنایا ہو لیکن نثر کی طرف خاص توجہ دی ہے۔ کسی کے یہاں سادہ نثر اور کسی کے یہاں عربی اور فارسی آمیز نثر پائی جاتی ہے۔ لیکن سادہ اور سہل نثر کی طرف ہر مصنف نے قدم بڑھایا ہے۔ یہاں پر مہدی افادی کی نثر کا ایک نمونہ پیش کیا جارہا ہے جو حسن وعشق کے معاملات پر ہے۔

''عورت کتنی ہی پاکیزہ وش ہو، اس خیال سے خالی نہیں ہوتی کہ کوئی اس کی کافرادائی کا شیدائی ہو، اس کی فتوحات، اس کا سرمایہ نشاط ہیں، جن سے اس کے دل کو راحت ملتی ہے اور جن سے وہ جیتے جی کبھی دست بردار نہیں ہوسکتی۔ وہ وار کر کے رہے گی۔ کیونکہ یہ امر اس کی فطرت میں داخل ہے۔ شانہ سے آنچل خود نہ گرائے، لیکن اگر اتفاق سے گر جائے تو وہ دل میں خوش ہوگی۔ یہ اس کی فطرت کا راز ہے جسے وہی خوب سمجھتی ہے۔ دہرائے ہوئے آنچل میں دراصل اسے سینے کا ابھار غائب کرنا

منظور نہیں بلکہ وہ چاہتی ہے کہ نظر جما کر دیکھئے ! محرم کا جائزہ

نظر ہی ایک طرح کی داد حسن ہے جو ہزار پارسائی کے ساتھ بھی

وہ آپ سے لے کر رہے گی۔"

(بحوالہ تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر وہاب اشرفی، ص: ۵۲۵)

سر سید احمد شعر وادب کی ترقی کے ساتھ ساتھ سائنسی تعلیم کا جدید نظام بھی قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد سے انہوں نے سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی لیکن دہلی کالج کی خدمات بے حد اہم سمجھی جاتی ہیں۔ فورٹ ولیم کالج اس لیے کھولا گیا تھا کہ انگریز ہندوستانی زبان، مزاج و کلچر سے آشنا ہو کر ہندوستان میں برطانوی سامراج کے استحکام کی کوشش کریں لیکن انگریزوں کی اس کوشش نے بھی اردو نثر کی ترویج اور اس کے مزاج کی تشکیل میں نمایاں رول ادا کیا جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے لیکن دہلی کالج کے قیام کا بنیادی مقصد علمی اور سائنسی ترقی کرنا تھا۔ اس کے قیام سے اردو کے وسیلے سے بہت سے مغربی علوم سامنے آ گئے۔ اس کالج کے ذریعہ طبیعات، کیمیا، ریاضیات، سیاسیات، تاریخ، جغرافیہ، صحافت اور ادبیات پر خاصا زور صرف کیا جانے لگا۔ دہلی کالج کے قیام کے بعد ہندوستان کی مختلف زبانوں کے علوم کی کتابوں کا معاملہ سامنے آیا۔ دیسی زبان میں مختلف عوام کی

کتابیں بہت کم تھیں لہٰذا اس کی طرف خاصی توجہ دی گئی۔

دہلی کالج میں مولوی ذکاء اللہ، نذیر احمد، منشی صدرالدین، امام بخش صہبائی، مولوی مملوک علی، ماسٹر رام چندر، ڈاکٹر ضیاء الدین، پنڈت من پھول اور مولوی کریم اللہ وغیرہ کی خدمات اہم ہیں۔ ماسٹر رام چندر کے متعلق صدیق الرحمٰن قدوائی لکھتے ہیں:

''دہلی کالج، ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی اور مجمع فواید العام تینوں اداروں کے سرگرم اراکین میں وہ سب سے زیادہ ممتاز اور نمایاں تھے۔ زمانہ طلب علمی میں ہی انہوں نے محنت، ذہانت اور خلوص کے ذریعے اساتذہ اور کالج کے منتظمین کو اپنا گرویدہ کرلیا تھا۔ چنانچہ کالج سے فارغ التحصیل ہوتے ہی ۲۸ر فروری ۱۸۴۴ء کو انہیں شعبہ علوم مشرقی میں بہ حیثیت استاد ریاضی کے رکھ لیا گیا۔ تقرر کے وقت تنخواہ پچاس روپیہ ماہوار مقرر ہوئی مگر مارچ ۱۸۴۸ء میں بڑھا کر سو روپے ماہوار کردی گئی۔ تقرر کے بعد ان کی مصروفیتوں میں اور اضافہ ہوگیا۔ مارچ ۱۸۵۴ء میں انہوں نے ''فواید الناظرین'' کے نام سے

ایک پندرہ روزہ اخبار نکالا، پھر دسمبر ۱۸۴۷ء میں ایک ماہوار رسالہ جاری کیا۔ ابتدا میں اس کا نام ''خیر خواہ ہند'' تھا مگر بعد میں اس کا نام ''محبّ ہند'' رکھ دیا گیا۔ یہ دونوں پرچے دہلی کالج سے شروع ہونے والی اصلاحی تحریک کا ایک اہم جز تھے۔ ان کے ذریعہ رام چندر نے علم وادب کی قابل قدر خدمات انجام دیں۔''

(''ماسٹر رام چندر'' صدیق الرحمٰن قدوائی، ۱۹۶۱ء، ص: ۳۴)

دہلی کالج میں اردو نثر کا نیا مزاج پیدا ہوا۔ روشن خیالی پیدا ہونے کی وجہ سے نئے علم وادب پھلنے پھولنے لگے۔ ماسٹر رام چندر کی طبیعت سائنسی موضوعات کی طرف مائل تھی اس لئے اردو کا دامن وسیع ہوا۔ انہوں نے کئی اخبار اور رسائل نکالے۔ ''عجائبات روزگار'' ان کی مقبول ترین کتاب ہے۔ وہ شگفتہ اسلوب کے مالک تھے۔ سائنسی ذہن کے باوجود سادگی اور روانی ان کی نثر کا جوہر ہے۔

مولوی ذکاء اللہ انیسویں صدی کے ایک فعال مصنف تھے۔ انہوں ایک سو سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ ''تاریخ ہندوستان'' ان کی بہت مقبول کتاب ہے۔ اٹھارہ حصوں

پر مشتمل اس کتاب کی مجموعی تعداد سات ہزار ایک سو انہتر صفحات ہیں۔ انیسویں صدی میں دلی کالج میں نثر نگاری کی کافی ترقی ہوئی۔ اس کالج کے اساتذہ نے نہ صرف دلی کالج کی شان بڑھائی بلکہ وہ لوگ اردو نثر نگاری کے سلسلے میں کافی مشہور ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اس کالج کو بے حد نقصان پہنچایا گیا۔ ۱۸۷۷ء میں اسے مستقلاً بند کر دیا گیا۔

انیسویں صدی کے اواخر میں مولوی عبدالحق نے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے اردو نثر کو بہت حد تک آگے بڑھایا۔

انیسویں صدی میں امانت لکھنوی، مداری لال اور آغا حشر کاشمیری کے کچھ ڈرامے نہ صرف بے حد مقبول ہوئے بلکہ اردو نثر کو عام فہم بنانے میں ان لوگوں کے کارنامے بھی اہم ہیں۔ امانت لکھنوی نے کئی ڈرامے لکھے لیکن ''اندر سبھا'' کے لئے وہ آج بھی جانے پہچانے جاتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس ڈراما کو انہوں نے واجد علی شاہ کی فرمائش پر لکھا تھا لیکن انہوں نے خود اس بات سے انکار کیا ہے۔ انہوں نے اپنی قوت تخیل سے یہ منظوم ڈراما لکھا جس کی سلاست اور فصاحت کی کوئی مثال سامنے نہیں آئی۔ یہ ڈراما خاص عوامی ہے۔ اس نے عوام کا بھی دل جیت لیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک جگہ خود لکھا ہے:

''دل میں در پردہ عشق کی آگ تھی، طبیعت کو حسن سے لاگ تھی۔ وضع کے خیال سے نہ کہیں جاتا تھا نہ کہیں آتا تھا۔ زبان کی بستگی سے گھر میں بیٹھے بیٹھے جی گھبراتا تھا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ حاجی مرزا عابد علی یگانہ ازلی، رفیق شفیق مونس، غمخوار، قدیمی جاں نثار، شاگرد اول، موزوں طبیعت، تخلص عبادت، عاشق کلام امانت، انہوں نے از راہ محبت کہا کہ بیکار بیٹھے بیٹھے گھبرانا عبث ہے۔ ایسا کوئی جلسہ رہس کے طور پر طبع زاد نظم کرنا چاہئے کہ وہ چار گھڑی دل لگی کی صورت ہووے۔ آخر الامر موافق ان کی فرمائش کے بندہ اس کے کہنے پر آمادہ ہوا۔ دم بدم شوق زیادہ ہوا.....غرض کہ چودھویں تاریخ شوال کی ۱۲۶۸ ہجری میں ''اندر سبھا'' اس جلسے کا نام رکھ کر بجائے چہار باب چار پریاں قرار دے کر شروع کیا۔

(بحوالہ تاریخ ادب اردو۔ ڈاکٹر وہاب اشرفی، ص:۵۶۱)

آغا حشر کاشمیری نے بیسویں صدی کی ابتدا میں اپنی اہمیت کا لوہا منوایا لیکن

انیسویں صدی کے آخر میں انہوں نے دو ڈرامے لکھے۔ ''مرید شک'' ۱۸۹۹ء اور ''مار آستین'' ۱۸۹۹ء۔

آغا حشر کی تخلیقی قوت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے بے حد پر اثر ڈرامے لکھے۔ ان کے اندر مکالمہ نگاری کی قوت اپنے ہم عصروں سے زیادہ تھی۔

اس جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انیسویں صدی سے پہلے جو اردو نثر تھی اس پر فارسی نثر کا گہرا اثر تھا۔ ''نوطرز مرصع''، ''عجائب القصص''، اور ''جذبہ عشق'' وغیرہ جو انیسویں صدی سے پہلے لکھی گئی تھیں ان میں فارسی انشا کے رنگ زیادہ تھے لیکن آہستہ آہستہ یہ رنگ اترنا شروع ہوا اور داستانی نثر میں نکھار اور سادگی پیدا ہونے لگی۔ اس نثر میں بیان کی قوت اور سلاست بیان کے عناصر شامل ہونے لگے جو آگے چل کر ادبی نثر میں معاون و مددگار ہوئے۔

فورٹ ولیم کالج میں جن کتابوں کا ترجمہ ہے، وہ نہایت سلیس اور سادہ زبان میں ہوا۔ اس کالج میں کام کرنے والے ترجمہ نگاروں نے اردو ادبی روایت کو آگے بڑھایا۔ ان کے یہاں فنی پختگی اور زبان دانی کے جوہر نمایاں ہیں۔ اس کالج نے اردو نثر کو بالیدگی و نمو کا سنہرا موقع عطا کیا۔

فورٹ ولیم کالج کا مقصد انگریزوں کے نو واردلوگوں کے سامنے ادب کے دلچسپ نمونے پیش کرنے تھے مگراس کالج کے باہر بھی داستان نویسی کی روایت پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ گرتھی۔ کالج سے باہر طبع زاد داستانیں بھی لکھی جارہی تھیں جو مشکل پسندی سے بتدریج سادگی وسلاست کی طرف مائل تھیں جو زمانے کے بدلتے ہوئے مزاج وحالات اور قدیم وجدید اقدار کے درمیان کش مکش کا نتیجہ تھی۔ کالج سے باہر لکھی گئی داستانوں کی نثر عربی و فارسی کی کثرت سے بہت حد تک پاک ہے۔ لفظی رعائتوں اور صنائع بدائع کے اثرات سے بھی بہت حد تک دور ہے۔ ان داستانوں میں عموماً اسلوب کے دو رجحانات ملتے ہیں۔ ایک سادگی وسچائی دوسرے تکلف اور رنگینی کا حامل جو قافیہ پیمائی کی سجاوٹ سے عبارت ہے۔ ان دونوں رجحانات کی لطیف آمیزش سے ان داستانوں میں سلاست اور ادبیت پیدا ہوگئی ہے۔

انیسویں صدی کے آغاز میں جس نثر کی ابتدا داستانوں کے تراجم سے ہوئی تھی وہ نثر ترقی کرتی ہوئی انیسویں صدی کی تیسری دہائی تک اس قابل ہوگئی کہ مختلف موضوعات کو اپنے اندر پیش کرنے لگی۔ اس نثر کو مکتوباتی نثر نے بھی متاثر کیا۔ مکتوباتی نثر ادبی نثر کی شکل اختیار کرنے لگی۔ دور واجد علی شاہ میں مکتوباتی نثر کو جذبوں کے اظہار کا

حوصلہ ملا۔

مرزا غالبؔ نے مکتوباتی نثر کو نئے اسلوب اور نئے موضوعات سے آشنا کیا۔ انہوں نے قدیم وجدید کا ایسا حسین امتزاج اردو نثر کو بخشا کہ یہ اپنے آپ میں لاجواب ہوگئی۔ انہوں نے جس لفظ کو چھولیا وہ معنی آفریں بن گیا۔

مختصر یہ کہ انیسویں صدی کی نثر کو مکتوباتی نثر نے بھی متاثر کیا اور اس میں جدید اسالیب بیان اور نئے موضوعات زندگی کے تمام رعنائیوں کے ساتھ پیش ہونے لگے۔ اس لحاظ سے انیسویں صدی کی نثر کو آگے بڑھانے اور عام کرنے میں اردو مکتوبات کی نمایاں حیثیت ہے۔

انیسویں صدی کی اردو نثر کے تاریخی وادبی سفر میں مذہبی، تاریخی، علمی، داستانی، سائنسی اور مکتوباتی ادب کے ساتھ ساتھ صحافت نے بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ پریس کی ترقی اور اخبارات کی اشاعت نے نثر کی روایت کو ملک کے گوشے گوشے میں پہنچا دیا۔ صحافت نے اسلوب مین شادابی، وسعت بیانی، وضاحت، سادگی اور ترسیلی قوت بھی پیدا کردی۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ اردو کی ادبی نثر کے ارتقا پر صحافت نے بھی خوشگوار اثر ڈالا ہے۔

اس طرح فورٹ ولیم کالج، دلی کالج اور سرسید وغیرہ نے اردو نثر کو ایک خاص امتیاز بخشا اور اس کے اندر جو ایک نئی قوت پیدا ہوئی اس سے جدید نثر پیدا ہوئی۔

☆☆☆

باب دوم

سرسید کی ابتدائی اردو نثر (سفر انگلستان سے قبل)

Early Urdu Prose of Sir Syed

(before his Journey to England)

سر سید کی ابتدائی اردو نثر سفر انگلستان سے قبل

سر سید احمد خاں کی ابتدائی اردو نثر کا تذکرہ کرنے سے پہلے ان کا مختصر سوانحی خاکہ پیش کر دینا ضروری سمجھتی ہوں کیونکہ وراثت اور ماحول کا اثر ہر آدمی کی شخصیت پر پڑنا ناگزیر ہے۔ کسی مصنف کی تخلیق کو بہتر طریقے سے سمجھنے کے لئے ان کے خاندانی حالات او رماحول کو سمجھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

سر سید احمد خاں ۱۷/اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب ۳۶ واسطوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ ان کے آبا و اجداد شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان آئے تھے اور اس وقت سے اکبر شاہ ثانی تک کسی نہ کسی حیثیت سے ان کا تعلق شاہی دربار سے جڑا رہا۔ شاہ عالم اور ان کے بعد اکبر شاہ کے زمانے میں ان کے دادا سید ہادی کو دربار عام اور دربار خاص میں جو درجہ حاصل تھا وہی درجہ ان کے والد میر تقی کو بھی حاصل رہا لیکن بادشاہت برائے نام رہ گئی تھی۔ اس لیے جن لوگوں کو خطابت اور منصب سے نوازا جاتا تھا اس کی تکمیل ٹھیک سے نہیں ہو پاتی تھی۔ سر سید کے والد میر تقی کو ہر سال

تاریخ جلوس کے جشن پر پانچ پارچہ اور تین رقوم جواہر کا خلعت عطا ہوتا تھا مگر اخیر میں انہوں نے جانا کم کر دیا تھا اور اپنا خلعت سرسید کو دلوانا شروع کر دیا تھا حالانکہ اس وقت ان کی عمر بہت کم تھی۔ سرسید بارہا اپنے والد کے ساتھ اور کبھی کبھی اکیلے بھی دربار میں بھی جایا کرتے تھے جہاں عام لوگوں کو جانے کی اجازت نہ تھی۔

سرسید نے ابتدائی تعلیم کے بعد ''گلستاں''، ''بوستاں'' اور ایسی ہی ایک دو کتابیں اور پڑھیں پھر عربی پڑھنا شروع کر دیا۔ پھر انہیں اپنے خاندانی علم ریاضی پڑھنے کا شوق ہوا۔ علم ریاضی میں ابتدائی کچھ کتابیں پڑھیں پھر علم طب پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ایک خاندانی حکیم غلام حیدر سے طب کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ جب ۱۸۳۸ء میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا تو قلعہ کی آمدنی میں سے مختصر سی رقم ان کی والدہ کے نام جاری رہی۔ باقی تنخواہیں بند ہو گئیں اس لیے سرسید احمد کو گورنمنٹ کی نوکری کا خیال پیدا ہوا۔ ان کے رشتہ دار قلعہ سے قطع تعلق کرنے پر راضی نہ تھے مگر انہوں نے حالات کو دیکھتے ہوئے انگریزی گورنمنٹ کی نوکری کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

سرسید کا بچپن عام لوگوں جیسا تھا۔ وہ اپنے دوسرے ساتھیوں سے زیادہ ذہین اور ہوشیار نہ تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کے اندر قابلیت اور عظمت پیدا ہوتی

گئی۔

سر سید کی والدہ نہایت ہوشیار اور عقلمند تھیں۔ سر سید کی پرورش و پرداخت میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔

سر سید دلی میں ہونے والے ''بسنت جلسہ''، ''درویشانہ جلسہ'' اور اس طرح کی بہت سی محفلوں اور جلسوں میں اپنے رشتے داروں کے ساتھ جاتے تھے جہاں رنگ رلیاں بھی تھیں اور گانے بجانے بھی۔ الطاف حسین حالی فرماتے ہیں:

''سر سید کا مذکورہ بالا جلسوں اور صحبتوں میں شریک ہونا آخر کار رنگ لائے بغیر نہ رہا۔ اگر چہ اس وقت تک دلی کے مسلمانوں میں قدیم سوسائٹی کی بہت سی خوبیاں باقی تھیں لیکن چونکہ ان کے اقبال کا خاتمہ ہو چکا تھا اس لیے ان کی سوسائٹی میں ان خرابیوں کی آہستہ آہستہ بنیاد پڑتی جاتی تھیں جن کو تنزل اور ادباء کا پیش خیمہ سمجھنا چاہئے۔ طبعتیں عموماً عیش ونشاط اور راگ رنگ کی طرف مائل ہوتی جاتی تھیں....سر سید نے انہیں جس حیرت انگیز طریقے سے اپنے تیئں اس دلدل سے نکالا وہ

درحقیقت ان کی زندگی کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔''

(حیات جاوید، الطاف حسین حالی، تیسرا ایڈیشن ۱۹۹۰ء، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ص:۵۸)

سرسید کے بھائی جن سے انہیں اتنی محبت تھی کہ اس کی مثال نہیں ملتی تھی، کا قبل از وقت انتقال ہوگیا تو سرسید احمد کا دل رنگین صحبتوں سے بالکل اچاٹ ہوگیا۔ حالی لکھتے ہیں:

''چنانچہ بھائی کے مرتے ہی ان کا دل رنگین صحبتوں سے بالکل اچاٹ ہوگیا۔ لباس اور وضع میں جو اس وقت بانکپن سمجھا جاتا تھا یک قلم ترک کردیا۔ سر گھٹوالیا، ڈاڑھی چھوڑ دی۔ پائنچے متشرع کرلئے، کرتا پہن لیا، رنگین طبع نوجوانوں کی صحبت رفتہ رفتہ کم ہونے لگی اور روز بروز مولویت کا رنگ چڑھنے لگا۔ اس وقت قوم میں یہی اعلیٰ درجہ ترقی انسان کا سمجھا جاتا تھا۔''

(حیات جاوید، الطاف حسین حالی، ص:۵۹)

سرسید احمد خاں کے ننہیالی خاندان کے کئی آدمی گورنمنٹ کی ملازمت میں تھے۔ ان کی روایات اور اس وقت کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے بھی کمپنی

بہادر کی ملازمت سے زندگی کے سفر کا آغاز کیا۔

۱۸۴۱ء میں مین پوری میں منصف مقرر ہوئے۔

۱۸۴۲ء میں ان کا تبادلہ ہو گیا اور وہ فتح پور سکری چلے گئے۔

۱۸۴۶ء میں دہلی آگئے۔ پھر بطور صدر امین بجنور میں رہے۔

۱۸۵۷ء میں صدر الصادر ہو کر مراد آباد گئے۔

۱۸۶۲ء میں غازی پور

۱۸۶۴ء میں علی گڑھ

۱۸۶۷ء میں جج کی حیثیت سے سمال کاز کورٹ بنارس چلے گئے اور ملازمت کے اختتام تک وہیں رہے۔

قیام بنارس کے زمانے ہی میں انہوں نے انگلستان کا سفر کیا۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بقیہ عمر علی گڑھ میں گزاری۔

۲۷ مارچ ۱۸۹۸ میں انتقال فرمایا۔ علی گڑھ ہی میں ۲۸ مارچ کو تدفین ہوئی۔

سرسید احمد مختلف الحیثیات شخص تھے۔ انہوں نے اپنی ہنگامہ خیز زندگی میں سیاسی، مذہبی، ادبی، تعلیمی اور تحقیقی غرض ہر قسم کے علمی اور قومی مشاغل میں لگے رہے۔

جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے، وہ اردو کے اولین معماروں میں تھے۔ اپنے نانا خواجہ فرید الدین احمد کے نقش قدم پر چل کر انہوں نے تصنیف و تالیف کو اپنے خیالات کا توشہ بنایا۔ علم و ادب سے آگہی اور رغبت میں ان کے تابناک عہد کا بھی بڑا حصہ رہا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی کے الفاظ میں:

''سرسید کی جس زمانے میں نشو ونما ہوئی دہلی میں اہل کمال کا مجمع تھا..... سرسید جس سوسائٹی کے ممبر تھے اس کے بڑے ارکان مفتی صد الدین آزردہ مرزا غالبؔ اور مولانا صہبائی تھے۔ ان میں ہر شخص تصنیف و تالیف کا مالک تھا اور انہیں بزرگوں کی محبت کا اثر تھا کہ سرسید نے ابتدائی دور میں جو شغل اختیار کیا، وہ تصنیف وتالیف کا مشغلہ تھا۔''

(محمڈن اینگلواورینٹل کالج میگزین، مئی ۱۸۹۸ء،ص:۲۰۶، نیز مقالات شبلی، دوم ص:۱۰)

قیام دہلی کے دوران میں علمی مجلسوں اور ادبی محفلوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔اس کے بارے میں خود رقم طراز ہیں:

''وہاں اکثر دوستوں اور بڑے بڑے نامی و باکمال لوگوں کا

مجمع ہوتا تھا۔ غالبؔ کی دلکش ومحبت آمیز بزرگانہ باتوں سے آزردہؔ کی دلچسپ ودل بافصاحت سے شیفتہؔ کی متین ونیم خندہ زن وضع سے اور صہبائی جاں نواز میخانہ کے محبت سے دلشادرہتا تھا۔“

(تہذیب الاخلاق جلد دوم، درمضمون سراب حیات، ازسید احمد خاں: ص:۵۲۹)

ان صحبتوں کے ساتھ ساتھ ان کی علمی تشنگی، ذاتی مطالعہ اور ذاتی صلاحیت نے نہ صرف ان کی شخصیت کو جلا بخشی بلکہ علم وادب کا میلان ان کے مزاج میں رچ بس گیا۔

سرسید نے ابتدا میں شاعری کی طرف قدم بڑھایا مگر یہ شغل ان کی طبیعت سے میل نہیں کھایا اور جلد ہی وہ نثر کی بہار آفرینی میں جٹ گئے۔

سرسید نے نثر کے ڈگمگاتے قدم کو سنبھالا اور زندگی کے مسائل کے ساتھ اس کا رشتہ جوڑا اور اردو ادب کو نئی فکر اور نئی دنیا سے آشنا کیا۔ سرسید کا ذہن تغیر پذیر اور ترقی پذیر تھا۔ اس تعمیرانہ ذہن کا اثر ان کی تصانیف پر بھی پڑا۔

سرسید کی ابتدائی اردو نثر کا جائزہ لینے کے لئے ان کے ابتدائی دور یعنی سفر انگلستان سے پہلے لکھی گئی تصانیف کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ انہوں نے اس دور میں بہت

سی کتابیں لکھیں ہیں۔ یہاں خاص خاص کتابوں کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔

ا۔ جام جم:۔ یہ کتاب سر سید احمد کی تالیف ہے۔ اس کا موضوع تاریخ ہے اور یہ فارسی زبان میں ہے۔ یہ ۱۸۴۰ء میں اکبرآباد سے شائع ہوئی اس میں ۲۳۰ صفحات ہیں۔ اس کتاب میں امیر تیمور صاحبقراں سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کل ۴۳ بادشاہوں کا مختصر ذکر ہے جو سب سلطنت ہند سے تعلق رکھتے ہیں۔

انتخاب الاخوین:۔ یہ کتاب سر سید احمد کی ثانوی تالیف ہے جو ۱۸۴۱ء میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں سر سید نے منصفی سے متعلق قانون دانی کا خلاصہ تیار کیا ہے۔ یہ کتاب گورنمنٹ میں پیش کی گئی اور منصفی کے عہد پر مقرر کئے جانے کی اجازت بھی ملی لیکن اسی سال اسی عہدہ کے لیے امتحان دینے کی شرط جاری ہوگئی۔ سر سید کو بھی کمشنر کی جانب سے امتحان دینے کی ہدایت دی گئی۔ انہوں نے اپنی ہی کتاب کے ذریعہ امتحان کی تیاری کی اور کامیاب ہو گئے۔

جلاءالقلوب بذکرالمحبوب:۔ اس رسالہ میں حضرت محمد ﷺ کی ولادت، معجزات، وفات اور دیگر حالات کا بیان ہے۔ اس رسالہ کا زیادہ تر مواد شاہ ولی اللہ کی تصنیف ''سروالمخزون'' اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی کتاب ''مدارج النبوت'' سے ماخوذ ہے۔

سر سید احمد نے اس رسالے میں متعلقہ زمانے کے خیالات کے مطابق صحیح اور صحت مند روایتوں کا پورا لحاظ رکھا ہے۔ اپنے عہد میں یہ رسالہ محفل میلاد کے لیے ایک اہم اور معتبر رسالہ ثابت ہوا۔ اس رسالے کی تحریر کا رنگ بے تکلفانہ ہے نہ لفظی بازی گری، نہ لفظی گل کاری، اور نہ صفت کاری ہے، درج ذیل اقتباس سے اس رسالے کی زبان و بیان کو سمجھا جاسکتا ہے:

> ''آپ اپنے یاروں کو بہت دوست اور معزز رکھتے تھے۔ ان کے سامنے کبھی پاؤں تک نہ پھیلاتے تھے اگر آدمیوں کی کثرت سے جگہ تنگ ہوجاتی تھی تو اب ان کے لئے جگہ کشادہ کردیتے تھے۔''
>
> (حیات جاوید، مولانا حالی، ص:۶۱)

یہ رسالہ ۱۸۴۲ء میں مرتب ہوا تھا اور دہلی سے اس کی اشاعت ہوئی تھی۔ اس کی ضخامت ۶۲ صفحات ہے۔

تحفۂ حسن:۔ یہ رسالہ عبدالعزیز کی فارسی زبان کی مذہبی تصنیف ''تحفۂ اثنا عشریہ'' کے دسویں اور بارہویں باب کا ترجمہ ہے۔ شیعوں کی جانب سے صدیق اکبر پر کئے جانے

والے اعتراضات اور جوابات پر مبنی یہ رسالہ ترجمے پر مبنی ان کا پہلا اور آخری رسالہ ہے جس میں شیعوں پر انہوں نے اعتراض کیا ہے اور ان کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اس طرح کا کوئی مضمون ایسا نہیں لکھا جس سے دوسرے فرقہ کے لوگوں کو ہدف ملامت بنایا گیا ہو۔ یہ رسالہ ۱۸۴۴ء میں تکمیل ہوا تھا۔

تسہیل فی جرالثقیل:۔ سائنسی موضوعات پر یہ سرسید کا پہلا کارنامہ ہے۔ ۱۸۴۴ء میں یہ شائع ہوا۔ ۳۸ صفحات پر مشتمل اس رسالے میں مکینکس کے پانچ اصول بیان کے گئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''جرالثقیل کا علم بہت عجیب وغریب ہے۔ ساری دنیا کے کارخانے اس پر موقوف ہیں۔ حق یہ ہے کہ اگر یہ علم نہ ہوتا تو دنیا کا کارخانہ نہ چلتا۔''

اس تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سادہ تحریر ٹھوس علمی موضوعات کو ذہن نشیں کرانے والی ہے جو سائنسی انکشافات اور ایجادات کے اظہار کے لیے موزوں ترین تحریر ہے۔ اس سے اردو نثر میں بے پناہ وسعت آئی۔ اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سے اردو نثر کے امکانات پہلے سے زیادہ روشن ہوئے ہیں۔ اس سے اردو نثر کی تنگ دامانی

بھی ختم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

فوائد الافکار:۔ یہ رسالہ ترجمہ پر مبنی ہے۔ اس کی اشاعت ۱۸۴۶ میں ہوئی۔ سرسید نے اپنے نانا سے پائے اس میراث کو اردو جامہ پہنچایا اور اپنی طرف سے مثالیں پیش کر کے اس کی اہمیت کو دوبالا کر دیا۔

آثار الصنادید:۔ سرسید کی شہرت و مقبولیت میں اضافہ کرے والی اور پڑھے لکھے لوگوں کے اندر دھوم مچانے والی یہی کتاب ہے۔ اسے سرسید نے جان ہتھیلی پر رکھ کر تصنیف کیا تھا۔ مغل بادشاہوں کی آخری سانس لے رہی دہلی کے آثار قدیمہ کی تاریخ لکھنے کی کوشش کی تو وہ دہلی کے قدیم کھنڈروں میں بھٹکتے پھرے، عمارتوں کے کتبوں کا چربہ اتارا اور ان کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کی۔ اس کتاب کو لکھنے کے لئے قطب مینار کے بعض کتبے زیادہ اونچائی پر تھے اس وجہ سے وہ نہیں پڑھے جاسکتے تھے۔ انہوں نے جان کو خطرے میں ڈال کر ان کتبوں کو نزدیک سے پڑھا اور ان کا چربہ اتارا۔ سینکڑوں تاریخی کتابوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور اپنی اس نادر تصنیف ''آثار الصنادید'' کو مکمل کیا۔

''آثار الصنادید'' ۲۱ رستمبر ۱۸۴۶ء کو مکمل ہوئی اور ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں کل چھ سو صفحات ہیں جو چار ابواب میں منقسم ہیں۔

پہلا باب ''عمارات شہر یاراں'' یعنی دہلی شہر کے باہر کی عمارتوں کے حال پر مشتمل ہے۔ اس میں شہر سے باہر کی ۱۳۰ عمارتوں کا بیان ہے جو ۲۳۸ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ قلعہ تغلق آباد کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

''یہ قلعہ غیاث الدین تغلق شاہ کے بیٹے ملک تغلق نے جو غیاث الدین بلبن کے غلاموں میں سے تھا، بنایا ہے۔ اس قلعہ کی تیاری ۷۲۱ھ میں شروع ہوئی اور بہت جلد تیار ہو گیا۔ کسی زمانے میں یہ قلعہ بہت نفیس و لطیف رہا ہو گا لیکن اب بالکل خراب اور ویران ہے۔ اکثر جگہ سے فصیل قلعہ کی قائم ہے مگر اندر کے مکان بالکل ٹوٹ گئے ہیں کہ نام و نشان تک نہیں رہا۔ بجز گڈھوں اور پتھروں کے ڈھیر کے اور کچھ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ قلعہ کے بیچ و بیچ میں ایک بہت بلند مکان بنا ہوا تھا اور وہ بادشاہ کی بیٹھک تھی اور اس کو جہان نما کہا کرتے تھے۔''

(آثار الصنادید، سرسید احمد خاں، ص:۱۹)

سرسید نے تمام جزئیات کا لحاظ رکھا ہے۔ تحقیق اور چھان پھٹک میں کوئی کسر

نہیں چھوڑی ہے ساتھ ہی تاریخی تفصیل نویسی سے بھی کام لیا ہے۔

دوسرے باب میں لال قلعہ اور اس کی عمارتوں کا حال ۴۴ صفحات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس باب میں جزوی عنوانات قائم کر کے ان پر الگ الگ تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ عنوانات ہیں:

''دروازہ جنوبی قلعہ معلیٰ، چھتہ لاہوری، دروازہ لاہوری، دروازہ قلعہ معلیٰ نقار خانہ، دیوان عام، نشیمن ظل الٰہی، امتیاز محل، معروف بہ رنگ محل، حال امتیاز محل کا اندر سے چھوٹی بیٹھک، جھروکہ، اسد برج، خوابگاہ مشہور بڑی بیٹھک، کتبہ محراب شمالی برج طلا معروف مثمن برج، شاہ محل معروف بہ دیوان خاص، تسبیح خانہ، عقب حمام، ہیرا محل، موتی محل، موتی مسجد، حال قلعہ معلیٰ از جانب ریتی، نور گڑھ وغیرہ۔ ان کے مطالعے سے لال قلعہ کا پورا حال اور اس کی عمارتوں کا پورا منظر ہماری آنکھوں کے سامنے جھلملانے لگتا ہے۔ موتی مسجد کے سلسلے میں جن تفصیلات کو انہوں نے پیش کیا ہے ملاحظہ فرمائیں:۔

''یہ ایک مسجد ہے حمام کے پیچھے مشرق بہ حیات بخش سر سے

پاؤں تک سنگ مرمر کی فرش اس کا اور در ودیوار محراب و مرغول

اور چھت اور منڈیر سب کی سب سنگ مرمر کی ہیں اور ایسے گل

بوٹے، بیل پتے بنائے ہیں کہ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں

حقیقت میں ایسی منبت کاری تمام قلعہ میں کسی پر نہیں بلکہ قلعہ

کیا، روئے زمین پر بھی نہ ہوگی.....''

(سرسید کی نثری خدمات۔ڈاکٹر مشتاق احمد، ص:۷۹)

تیسرے باب میں شہر شاہ جہاں آباد کے احوال درج ہیں۔اس باب میں شہر شاہ جہاں آباد کی عمارتوں، مسجدوں، مدرسوں، حویلیوں، کنوؤں، باولیوں، مندروں، بازاروں اور مزاروں کے تذکرے، ان کا جغرافیہ اور محل وقوع کی نشاندہی ملتی ہے۔

چوتھے اور آخری باب کی شروعات ان قلعوں اور شہروں کے بیان سے ہوتی ہے جو از منہ قدیم تادم تحریر دلی میں تعمیر اور آباد ہوئے تھے۔اسی کے ساتھ دہلی کی آب و ہوا اور زبان کی پیدائش کا بیان ہے۔ڈاکٹر مشتاق احمد فرماتے ہیں:

''چوتھے اور آخری باب کی شروعات ان قلعوں اور شہروں کے

بیان سے ہوئی ہے جو از منہ قدیم تادم دلی میں تعمیر اور آباد

ہوئے تھے۔ اسی کے ساتھ دہلی کی صفات آب و ہوا اور اردو

زبان کی پیدائش و ارتقا کا بیان بھی ہے اور تب دہلی کے ۱۲۰

مشاہیر کا تذکرہ ہے جو کہ نہایت جامع ہے جن مشاہیر کی احوال

بیانی میں قلم کی جولانی دکھلائی گئی ہے ان میں مشائخ،

فقراء، علماء، اطباء، شعراء، خوش نویس، مصور، موسیقی داں وغیرہ

سبھی طرح کے فنکار و عظام شامل ہیں۔''

(سرسید کی نثری خدمات، ڈاکٹر مشتاق احمد، ص:۶۹)

اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ چوتھے باب کے دوسرے حصے میں فنون لطیفہ کے

ماہرین کے حالات اور کارنامے بیان کئے گئے ہیں اس حصے میں سرسید احمد نے بھرپور علمی

وقار پیدا کرنے کی کوشش میں فقرے کو پیچیدہ اور گنجلک کر دیا ہے۔ سرسید احمد سے بے انتہا

پیار رکھنے والے امام بخش صہبائی کے ذکر میں سرسید قدیم اسلوب کے جال میں پھنس گئے

ہیں۔ مثلاً:

''رنگ زرائے آئینۂ سخنوری، مستعل مرأت، معنی پروری، نخل

بند حدیقۂ کمالات صوری، پردہ کشائے حسن و جلال معنوی،

معجزہ طراز، طرہ تازہ، بزم افروز، حمائد بے اندازہ، ساقی خم کدہ سخن سرائی مولوی امام بخش متخلص بہ صہبائی۔

یہ کوئی تنہا مثال نہیں بلکہ تمام عظمت رسیدہ اشخاص کے بیان میں مقفیٰ ناہموار صنعت لفظی اور پر تصنع جملوں کا التزام کیا گیا ہے جس میں سے مقصد بیان دھند لکے میں گم ہوکر رہ گیا ہے۔ بہت مغزماری اور ذہنی ورزش کے بعد بیان کردہ شخصیتوں کے بارے میں تھوڑی سی واقفیت ہوتی ہے۔''

(سرسید کی نثری خدمات، ڈاکٹر مشتاق احمد، ص:۷۰)

چوتھے باب کے آخر میں مرزا غالبؔ کی فارسی نثر میں تقریظ اور امام بخش صہبائی کا ریویو (فارسی میں) شامل ہے۔ مولوی صدرالدین آزردہ کی منظوم تقریظ (فارسی میں) کے بعد یہ کتاب ''آثارالصنادید'' اپنے اختتام کو پہنچ جاتی ہے۔

''آثارالصنادید'' لکھنے میں سرسید احمد خاں کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس کا اندازہ ''حیات جاوید'' کے مصنف الطاف حسین حالی کے ان جملوں سے لگایا جاسکتا ہے:

''باہر کی عمارتوں کی تحقیقات کرنی ایک نہایت مشکل کام تھا۔ بیسیوں عمارتیں ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر ہو گئی تھیں۔ اکثر عمارتوں کے کتبے پڑھے نہ جاتے تھے۔ بہت سے کتبوں سے ضروری حالات معلوم نہ ہو سکتے تھے۔ اکثر کتبے ایسے خطوں میں تھے جو متفرق و پراگندہ اجزا باقی رہ گئے تھے۔ ان سے کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ یہ عمارت کیوں بنائی گئی تھی اور اسے کیا مقصد تھا۔ کتبوں میں جن بانیوں کے نام لکھے تھے ان کا مفصل حال دریافت کرنے کے لئے تاریخوں کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت تھی۔ بعض علمی عمارتوں کی حالت ایسی متغیر ہو گئی تھی کہ ان کی ماہیت معلوم ہونی مشکل تھی۔ پھر اکثر عمارتوں کے عرض وطول وارتفاع کی پیمائش کرنی، ہر ایک عمارت میں صورت حال قلم بند کرنی، کتبوں کے چربے اتارنے اور ہر ایک کتنے کو بعینہ اس کے اصلی خط میں دکھانا.... کچھ اوپر سوا سو عمارتوں کی تحقیقات سے عہدہ برآ ہونا فی الحقیقت نہایت دشوار کام تھا۔''

(حیات جاوید، الطاف حسین حالی، ص:٦٥)

جب پہلا ایڈیشن شائع ہوا تو مسٹر رابرٹس جو اس وقت کلکٹر و مجسٹریٹ شاہ جہاں آباد تھے جنہیں پرانی چیزوں کی تحقیقات کا نہایت شوق تھا، دیکھ کر بے حد خوشی ہوئے اور اس کا ترجمہ انگریزی میں کروانے کی خواہش ظاہر کی۔ سر سید احمد نے اس نئے ایڈیشن میں کچھ ترمیم اضافہ کر کے اس کے اندر جو کمی تھی اسے پورا کر دیا۔ اس کی عبارت میں پہلے ایڈیشن کے مقابلے نہایت سادگی ہے۔ اس ایڈیشن کے لئے سر سید نے نقشے بھی از سر نو عمدہ قسم کے تیار کرائے تھے۔ دراصل سر سید نے جب مغربی علوم کا گہرائی سے مطالعہ کیا تو انہیں ’’آثار الصنادید‘‘ کے کمزور پہلوؤں کا احساس ہوا تھا۔ حقائق کے بیان میں غیر متعلق باتوں کو کتاب سے ہٹا دیا۔ ۱۹۵۴ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ گارساں دتاسی نے اس کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کرایا۔ فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہو جانے کے بعد سر سید احمد پورے یوروپ میں متعارف ہو گئے۔ یہاں تک کہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے انہیں انعامات و اکرام سے بھی نوازا اور اپنا اعزازی فیلو مقرر کیا۔ وہ یوروپ کے علمی اور ادبی حلقوں میں بے حد مقبول ہو گئے۔ دوسرا ایڈیشن نقائص سے پاک بھی ہے اور مغربی آداب تحقیق کا آئینہ دار بھی۔ انداز بیان بھی بدلا ہوا ہے۔ لفاظی نہیں ہے اور نہ بیان میں ابہام یا اثقال ہے۔ عبارت بالکل سیدھی سادی ہے۔ اس کے اندراج میں بھی تدیلی لائی گئی

ہے۔ دیباچہ میں بھی سادگی ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ''آثار الصنادید'' کے پہلے ایڈیشن میں جو کمیاں تھیں انہیں دوسرے ایڈیشن میں دور کردیا گیا ہے۔ پہلے ایڈیشن کا چوتھا باب حذف کردیا گیا ہے۔ اس حصے میں کوئی الجھاؤ یا ثقالت نہیں ہے:

''اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اس ناچیز آدمی کو کیا کیا نعمتیں عنایت کی ہیں۔ آنکھ دی ہے کان دیئے ہیں، عقل دی ہے، زبان دی ہے کہ ہر ایک بات کو دیکھ بھال کر سن سنا کر سوچ سمجھ کر کرتا ہے اور ایسی باتیں نکالتا ہے جس کو دیکھ کر لوگ حیران و ششدر رہ جاتے ہیں پھر ایسے پروردگار کا شکر کب ادا ہو سکتا ہے۔''

(دیباچہ آثار الصنادید، دوسرا ایڈیشن، ص:۱)

مجموعی طور پر ''آثار الصنادید'' کا دوسرا ایڈیشن پہلے ایڈیشن سے بہتر ہے۔

قول متین در ابطال حرکت زمین:۔ سرسید احمد نے اس رسالے کو ۱۸۴۸ء میں شائع کروایا تھا۔ اس میں علمی اور سائنسی موضوع کو اٹھایا گیا ہے۔ نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ

اس میں زمین کی گردش سے متعلق نظریات پر بات کی گئی ہے۔ انہوں نے اس رسالہ میں دلائل سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ زمین حرکت یا گردش نہیں کرتی ہے بلکہ اپنی جگہ پر جامد رہتی ہے۔ انہوں نے اس رسالہ کو جس وقت قلم بند کیا تھا اس وقت ان پر یہ انکشاف نہیں ہوا تھا کہ زمین اپنے محور و مرکز پر گردش کرتی ہے۔ علمی حقیقت سے روشناس ہونے کے بعد انہوں نے اپنے اس پرانے خیالات کو مسترد کر دیا تھا اور یہ مان لیا تھا کہ زمین روزانہ اور سالانہ کے حساب سے اپنے محور پر گھومتی ہے۔ جس کی وجہ سے دن رات ہوتا ہے اور موسم میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

یہ رسالہ کسی اہمیت کا حامل نہیں ہے لیکن سادہ نثر لکھنے کا رواج بڑھتا ہے کیونکہ سر سید نے اس رسالے کو سادہ نثر میں لکھا ہے۔

ترجمہ فیصلہ جات صدر مشرق وصدر مغرب:۔ یہ رسالہ بھی ترجمہ کیا ہوا ہے اس میں عدالتوں میں ہونے والے مقدمات کے فیصلوں کا ترجمہ ہے۔ وہ قانون کے طلبہ تھے اس لیے انہیں ایسی باتوں سے دلچسپی تھی ورنہ عام آدمی کے لئے یہ رسالہ کوئی خاص معنی نہیں رکھتا۔

کلمۃ الحق:۔ سر سید احمد اصلاح پسند تھے۔ اصلاح پسندی ان کے رگ و ریشہ میں سرایت

کی ہوئی تھی۔ مذہب میں بھی اگر انہیں کوئی غلط بات نظر آتی تو وہ جرأت مندی کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کر دیتے تھے۔ پیری مریدی اور بیعت کے غلط طریقے رائج ہو گئے تھے اس لیے انہوں نے یہ رسالہ ۱۸۴۹ء میں شائع کروایا۔ مذہبی مسائل میں ایسے رائج ہو جانے والے اصولوں کو غلط ثابت کرنے کے لئے یہ رسالہ انہوں نے لکھا تھا۔ انہوں نے اس رسالہ کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا کہ ان کے خیالات سچائی پر مبنی ہیں۔ اس رسالہ کے سلسلے میں انہوں نے خود ہی لکھا ہے:

"یہ کلمۃ الحق بے اختیار پیری و مریدی کے بیان میں ہماری زبان سے نکلا ہے۔ کیونکہ ہمارے زمانے میں پیری و مریدی کا ایسا جھگڑا لگا ہے جس کے سبب ہزاروں آدمی دھوکہ میں پڑے ہیں۔ جہاں ایک نئی صورت کا آدمی دیکھا کوئی تو اس کو قطب کہتا ہے اور کوئی ابدال کوئی ولی اور کوئی غوث اور پھر وہ ویسی ہی باتیں کرتا ہو۔ اس پر کچھ خیال نہیں کرتے۔"

(تصانیف احمدیہ در کلمۃ الحق، سید احمد خاں، ص:۱)

سر سید کی یہ تصنیف مذہبی تصانیف میں ایک اہم کتاب ہے۔

راہ سنت در رد بدعت:۔ ۱۸۵۰ء میں سرسید نے اس رسالہ کو لکھا تھا جو اہل بدعت کے خلاف متبعین سنت کی تائید میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سرسید نے اسے اپنی وہابیت کے جوش میں تحریر کیا تھا۔ اس رسالہ سے جہاں ایک طرف شاہ ولی اللہ کی تحریر سے متاثر سرسید کی آزادی کا پتہ چلتا ہے وہیں دوسری طرف ان کے اجتہادی رجحانات کی عکاسی ہوتی ہے۔

نمیقہ در بیان تصور شیخ:۔ یہ سرسید کی مذہبی تصانیف کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ مختصر سی تحریر فارسی زبان میں ہے جو ۱۹۵۲ء میں لکھی گئی۔

سلسلۃ الملوک:۔ سرسید کی لکھی ہوئی یہ کتاب بہت اہم ہے۔ یہ ایک تاریخی کتاب ہے جو ۱۸۵۲ء میں مرتب ہوئی۔ اس میں ان بادشاہوں اور راجاؤں کی فہرست ہے جو کم و بیش پانچ ہزار سال سے دہلی میں عہد بہ عہد فرمانروا ہوتے چلے آئے تھے۔ راجا یدھسٹر دہلی کا پہلا بادشاہ تھا۔ اس میں راجا یدھسٹر سے لے کر ملکہ معظّمہ قیصر ہند تک ۲۰۲ حکمرانوں کے ضروری کوائف جمع کئے گئے ہیں۔ ان سب بادشاہوں کے نام ''ولدیت''، سن جلوس، سنہ انتقال اور ان کے دارالسلطنت نہایت تحقیق کے ساتھ لکھ دیے گئے ہیں۔

ترجمہ کیمیائے سعادت:۔ یہ حضرت امام غزالی کی مشہور و معروف مذہبی کتاب کیمیائے سعادت ہے۔ سرسید نے امام غزالی کی اس تصنیف کے تین ابتدائی فصلوں کا اردو میں

ترجمہ کیا ہے۔۱۸۵۳ء میں یہ کتاب ترجمہ کی گئی ہے۔اب یہ کتاب تصانیف احمدیہ میں شامل ہے۔

تاریخ ضلع بجنور:۔ جب سرسید کا تبادلہ بجنور میں ہوا تھا تو ان ہی دنوں محکمہ صدر بورڈ سے تمام ضلع کے نام یہ فرمان جاری ہوا کہ جس ضلع کا بندوبست ختم ہوجائے اس ضلع کی ایک مفصل تاریخ لکھوائی جائے۔صاحب کلکٹر کی ایما پر سرسید احمد خاں نے تاریخ ضلع بجنور لکھنے کی ذمہ داری قبول کرلی۔تاریخ سے دلچسپی ہونے کی وجہ سے انہوں نے اسے ۱۹۵۵ء میں بڑی محنت اور جانفشانی سے مکمل کیا اور ضلع حکام کے حوالے کردیا لیکن افسوس کا مقام ہے کہ یہ کتاب زیور طباعت سے آراستہ نہ ہوسکی کیونکہ جب یہ چھپ ہی رہی تھی کہ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کی ہنگامہ خیزی میں برباد ہوگئی اور سرسید کی محنت رائیگاں گئی۔

''تاریخ ضلع بجنور'' میں تاریخ کے علاوہ دیگر امور سے بھی بحث کی گئی تھی جس میں سنہ فصلی اور سنہ عملی پر بحث کرتے ہوئے دونوں میں فرق نہ کرنے کی ہدایت دی تھی اور دونوں کو دفاتر کے کاموں میں ایک ہی تصور کرنے کا مشورہ دیا تھا۔اس سے پیدا ہونے والی مشکلات کی طرف بھی حکومت کی توجہ دلائی گئی تھی۔

تصحیح آئین اکبری:۔ مغل بادشاہ اکبراعظم کے ایک وزیر مشیر ابوالفضل نے بادشاہ کے

اصول وضوابط پر ''آئینہ اکبری'' لکھی تھی۔ اس کی زبان فارسی تھی وہ بھی بالکل نئے طرز کی۔ اس کا اسلوب بیان دشوار تھا اور کاتبوں کی بے پروائی سے اس میں بہت سی غلطیاں راہ پاگئی تھیں۔ خود اس کے مصنف نے بھی کہیں کہیں غلطیاں کی تھیں۔ یہاں تک کے بعض جدولوں کے خانے سادہ اور خالی تھے۔ اس تصحیح کا کام بہت ہی محنت طلب تھا۔ دہلی کے ایک تاجر کی تحریک پر سرسید احمد نے اس کتاب کی اصلاح کا بیڑا اٹھالیا اور ۱۸۵۶ء میں ''آئین اکبری'' کی پہلی اور تیسری جلدوں کی تصحیح مکمل کرڈالی۔ سرسید کی مرتب شدہ کتاب جب منظر عام پر آئی تو بے حد مقبول ہوئی۔ اس کی دوسری جلد کی تصحیح کر کے انہوں نے پریس میں دیا تھا لیکن یہ بھی ۱۸۵۷ء کی ہنگامہ خیزی کی شکار ہوگئی۔ اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر مشتاق احمد لکھتے ہیں:

> ''آئین اکبری'' جیسی نادرالوجود کتاب کی تصحیح وتہذیب اور ایک نامور مصنف اور ایک نامور بادشاہ کے کارناموں کو دل نشیں صورت میں پیش کرنا ایک غیر معمولی کام تھا۔ انہوں نے بہ ہمت تمام یہ کام انجام دیا کتاب کی اصل متن کی صحت کا خصوصی اہتمام کیا۔ جو اصطلاحیں اکبر کے زمانے میں مروج و

مستعمل تھیں یا خود ابوالفضل نے اختراع کی تھیں۔ ان کی تشریح کی۔ فارسی، عربی، ترکی، ہندی اور سنسکرت کے غریب الفاظ کی شرح کی۔ قدیم اوزان ونقود کی نئے اوزان ونقود سے مطابقت کی۔ کہیں کہیں جن جدولوں میں مصنف نے خانے خالی چھوڑ رکھے تھے یا ان سے غلطی سرزد ہوگئی تھی۔"

(سرسید احمد کی نثری خدمات، ڈاکٹر مشتاق احمد، ص:۷۶)

دوسرے دور یعنی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد کی تصانیف:

تاریخ سرکشی ضلع بجنور:۔ یہ سرسید احمد کے دوسرے دور کی پہلی تصنیف ہے۔ اس کتب میں تاریخ کے تعین کے ساتھ پہلی جنگ آزادی جس کا نام غدر دیا گیا تھا، کے وہ واقعات بیان کئے گئے ہیں جو مئی ۱۸۵۷ء سے اپریل ۱۸۵۸ء تک بجنور میں گزرے تھے۔

اس کتاب کو دیکھنے اور پڑھنے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ سرسید ابتدا سے آخر تک ایسی حالت میں جبکہ ہر طرف بغاوت چل رہی تھی اور ہر خاص وعام کی جان کو خطرہ لاحق تھا، اس کتاب کے لئے مواد جمع کررہے تھے۔

سرسید احمد نے خود بیان کیا ہے کہ اس کتاب میں بہت سے واقعات ان کی

آنکھوں کے دیکھے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ بہت سے ایسے واقعات بھی تھے جن سے ان کا براہ راست تعلق تھا کیونکہ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی کے دوران حکومت کی طرف سے ضلع بجنور کا سارا انتظام ان ہی کے سپرد تھا۔ اس کتاب کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں:

''الٰہی تو مجھ کو توفیق دے کہ یہ تاریخ میری پوری ہو اور صحیح بات اس میں لکھنے کی ہدایت کر، کیونکہ طرفداری کی تاریخ لکھنی ایسی بے ایمانی کی بات ہے کہ اس کا اثر ہمیشہ رہتا ہے اور اس کا وبال قیامت تک مصنف کی گردن پر ہوتا ہے۔ اس تاریخ مین جو کچھ لکھا ہے، بہت سا اس میں میری آنکھوں کا دیکھا ہے اور بہت سا اپنے ہاتھ کا کیا ہوا اور اس کے سوا جو کچھ لکھا ہوا ہے وہ نہایت تحقیقات اور بہت صحیح اور نہایت سچ لکھا ہے۔''

(تاریخ سرکشی ضلع بجنور، سرسید احمد خاں، ص:۱)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید احمد تاریخ نگاری کے فنی تقاضوں سے اچھی طرف واقف تھے۔ طرفداری کی تاریخ لکھنا وہ گناہ عظیم سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ''سرکشی بجنور'' کے زیادہ تر واقعات انہوں نے تاریخی صداقتوں کے ساتھ بیان کردیئے

ہیں۔ انہوں نے ضلع کے باشندوں اور آزادی کے جاں نثاروں کے نام کے ساتھ بدمعاش، نمک حرام، حرام زادہ اور کمبخت جیسے ہتک انگیز الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اس کے برعکس انگریزوں اور ان کے حمایتوں کے لئے تعریفی جملے لکھے ہیں۔ انگریز حکام کو صاحب بہادر، آقا دام اقبالہم کے القاب سے نوازا ہے۔ ظاہر ہے ایسا بیان انگریزوں کی خیر خواہی ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ حکومت سے اپنی وفاداری ظاہر کرنے اور بغاوت میں اپنی خدمات اجاگر کرنے کی خواہش ان کے اندر تھی۔ بھلے ہی اس کتاب کی تصنیف کا مقصد جذبہ تاریخ نگاری کو آسودہ کرنا ہی کیوں نہ رہا ہو۔

اسباب بغاوت ہند:۔ سر سید کی قومی ہمدردی اور محبت و اخلاق اور جرأت کی یادگار یہ تصنیف ہے۔ یہ ۱۸۵۸ء میں چھپی تھی۔ سر سید احمد ضلع بجنور میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا عبرت انگیز نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ جن سے انہیں بے حد تکلیف ہوئی تھی اور دل پر گہرا صدمہ پہنچا تھا مگر مراد آباد میں مسلمانوں سے بدگمان انگریزوں اور ان کے خیر خواہوں کے ظلم وستم زیادہ دیکھے تھے۔ بغاوت کے اسباب پیدا کرنے کی ذمے داری مسلمانوں کے بجائے ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظم ونسق پر عائد ہوتی تھی۔ مگر تمام تر وفاداریوں کے باوجود کھل کر یہ بات بتانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ ''تاریخ سرکشی بجنور'' لکھتے

وقت شاید وہ اتنی ہمت نہ کر پائے تھے لیکن اس کتاب کو انہوں نے بڑی جرأت اور ہمت سے لکھی۔ اسباب بغاوت کا تجزیہ کیا اس کے بعد یہ کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' لکھ کر اس کی ایک کاپی گورنمنٹ آف انڈیا کو اور کچھ جلدیں برطانوی پارلیامنٹ کو بھیج دیں جس پر پارلیامنٹ میں بحث ومباحثہ ہوا۔ بہت سے لوگوں نے سرسید احمد کو غدار کہا تو بہت سے لوگوں نے اسے حکومت کی خیر خواہی پر محمول کیا۔ ڈاکٹر مشتاق احمد کے مطابق:

> ''اس کتاب میں انہوں نے نہایت مدلل اور سلجھے ہوئے انداز میں مسلمانوں کو بے قصور ثابت کیا ہے اور انگریزوں کی بدتربیریاں اور سختیاں گنائی ہیں۔ اہل ہند نے سرکشی کے لئے پہلے سے کوئی سازش نہ کی تھی۔ مسلمانوں میں بھی جہاد کی کوئی سازش نہ تھی۔ اودھ کی ضبطی بھی اس عام فساد کا باعث نہ تھا۔ بلکہ بہت سی باتیں پہلے سے جمع ہورہی تھیں جن سے ہندوستانیوں کا دل گورنمنٹ سے پھٹا جاتا تھا اور اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ انتظام حکومت ، قانون سازی اور مشورہ و تدبیر میں ہندوستانیوں کو کوئی دخل نہیں تھا اور حاکم و رعایا کے درمیان

تبادلہٗ خیالات کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ جس کی وجہ سے اہل ہند گورنمنٹ کے قوانین کی مصلحت نہیں سمجھ سکتے تھے۔ پھر ان قوانین کی مصلحتوں کو سمجھانے کے بجائے انہیں جبریہ نافذ کیا گیا۔ اس سے دوہری غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ ایک یہ کہ سرکار ہندوستانیوں کو تباہ کر کے مفلس بنانا چاہتی ہے اور دوسرے یہ کہ ان کے مذہب میں مداخلت کر کے انہیں عیسائی بنانا چاہتی ہے۔ یہ سارے مسائل مدتوں سے ہندوستانیوں کے دل میں جمع ہو ہی رہے تھے کہ چربی سے بنے کارتوس کاٹنے کا فوجیوں کو حکم ہوا اور نافرمانی کرنے پر میرٹھ کی فوج کو پابند زنجیر کر کے رسوا کیا گیا۔ جس سے فوجیوں کی جوش حمیت للکار اٹھی اور سارے ہندوستان میں سرکشی اور بغاوت پھیل گئی۔''

(سرسید کی نثری خدمات، ڈاکٹر مشتاق احمد، ص:۸۰)

''اسباب بغاوت ہند'' لکھ کر سرسید احمد نے اپنے قوم کی وکالت کی ہے لیکن کچھ باتیں مسلمانوں کے خلاف بھی جاتی ہیں جیسے ان کا یہ کہنا کہ جن لوگوں نے جہاد کا جھنڈ

ابلند کیا، ایسے خراب اور بدرویہ اور بداطوار آدمی تھے کہ جز شراب خوری اور قماش بینی اور ناچ رنگ دیکھنے کے کچھ وظیفہ ان کا نہ تھا......

یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ علم بغاوت بلند کرنے والوں میں ہندو مسلمان، شرابی بدمعاش اور تہجد گزار بھی تھے۔

بہر حال سرسید کا یہ کارنامہ قابل قدر ہے۔ انگریزی حکومت میں رہتے ہوئے مسلمانوں کی بہت سی شکایتوں کو سامنے لانا اور سچائی بیان کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس کتاب کا اثر اتنا ہوا کہ ناراضگی اور غیض وغضب کا دور ختم ہوا انگریزوں نے اپنی غلطیوں کو سمجھا اور حالات معمول پر آئے۔

سرسید احمد کی ان کتابوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سفر انگلستان سے قبل انہوں نے جو کتابیں تصنیف کیں اور ترجمے کئے ان کی نثر کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس میں ان کے رجحانات میں دو الگ الگ رنگ ہیں۔ پہلے حصے کی نثر پرانے رنگ کی ہے اور دوسرے حصے میں مغربی طرز زندگی اور جدید خیالات کا کچھ نہ کچھ اثر دکھائی دیتا ہے۔ مگر اس وقت یہ اثر سطحی اور ہلکا ہے۔

سرسید کو ریاضی اور تصوف کا مذاق اپنے خاندان سے ورثے میں ملا تھا۔ تاریخ

نگاری بھی قدیم ماحول کی عطا کردہ ہے۔ اس کے علاوہ ان کی ابتدائی نثر میں مناظرہ، تقابل اور مذاہب کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اس دور میں ان کا نظریہ خالص علمی اور دینی تھا۔ زندگی کی مادی قدروں کی پوری اہمیت ابھی ان پر منکشف نہ ہوئی تھی۔ اس دور میں آثار قدیمہ کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ آگے چل کر جنگ آزادی (غدر) میں مسلمانوں کی شرکت کے الزام کو جھوٹا قرار دینے کی کوشش میں ''اسباب بغاوت ہند'' لکھ کر انگریزوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ اس دور میں سرسید نے قدیم موضوعات کو نئے طرز بیان سے روشناس کرایا۔ یہ ان کا نثر میں اہم کام ہے۔ پرتکلف اسالیب فارسی سے اردو نثر کو آزاد کرتے ہوئے انہوں نے اسلوب میں جدید رجحانات کے لئے راستہ صاف کیا۔ سرسید احمد کی ابتدائی نثر کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اردو نثر کو اپنی زندگی کا ہی نہیں بلکہ وسیع معاشرے کا ترجمان بنایا۔

باب سوم

مضامین سرسید۔ موضوع ومواد

Essays of Sir Syed - Topics & Content

مضامین سرسید۔ موضوع ومواد

سرسید کی شخصیت دلکش اور ہمہ گیر تھی۔ وہ اصلاح معاشرہ کے علمبردار، ماہر تعلیم، سیاسی مدبر، روشن خیال مذہبی مفکر، بے خوف صحافی، اچھے مورخ اور موئثر اور فکر انگیز تحریر کے مالک تھے۔ ان کی جدوجہد کا میدان بے حد وسیع تھا اور ان کی فکر میں ایک نئی توانائی تھی۔ سماج، سیاست، علم وادب، مذہب اور تہذیب وتمدن ومعاشرت، جس میدان میں انہوں نے قدم رکھا وہاں اپنا گہرا نقش ثبت کردیا:

تیرے احسان رہ رہ کر سدا یاد آئیں گے ان کو
کریں گے ذکر ہر مجلس میں اور دہرائیں گے ان کو

سرسید احمد قومیت کا اعلیٰ ترین تصور بھی رکھتے تھے اور ملک کی آزادی بھی چاہتے تھے۔ حالات کے تجزیے سے ان کو اندازہ ہوگیا تھا کہ مسلمانوں کا سیاست سے الگ رہ کر ترقی کرنا اور آگے بڑھنا ممکن نہیں ہے اور نہ مغربی علوم پر پوری طرح دسترس حاصل کئے بغیر قوم کا کوئی منصوبہ کامیاب ہوسکتا ہے۔ اس لئے انہوں نے مسلمانوں کو ایک

نئی راہ دکھانے کی کوشش کی۔ بقول خلیق احمد نظامی:

''انیسویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے اصلاح معاشرہ، تجدید فکر اور احیاء ملی کے لیے جن مصلحین نے مسلسل اور پرخلوص جدوجہد کی ان میں ترکی کے مدحت پاشا اور فواد پاشا ایران کے حجۃ الاسلام شیخ ہادی نجم آبادی، مصر کے مصطفےٰ کمال، تیونس کے خیر الدین پاشا، الجیریا کے امیر عبدالقادر اور نجد میں مولانا محمد بن عبدالوہاب کے حلقۂ فکر کے اکابر، طرابلس میں امام محمد بن ثفوی، افغانستان میں سید جمال الدین افغانی اور ہندوستان میں سرسید احمد خاں کے نام تاریخ بھلانہیں سکتی۔ انھوں نے سماجی اصلاح کی نئی راہیں کھولیں اور فکر ونظر کے نئے سانچے تیار کئے جن کے اثرات آج تک ان ملکوں کی زندگی میں کارفرما ہیں۔ سرسید کی شخصیت ان سب میں نہ صرف منفرد تھی بلکہ بعض اعتبار سے ایک امتیازی شان کی حامل تھی۔ اقبال نے صحیح لکھا ہے کہ وہ دورِ جدید کے پہلے مسلمان ہیں جس

نے آنے والے زمانے کے ایجابی مزاج کی ایک جھلک دیکھ لی تھی اور اپنی جدوجہد کا رخ اسلام کی نئی تفسیر وتعبیر کی طرف کر دیا تھا۔"

(مقدمہ سر سید اور ہندوستانی مسلمان، ص:۱۱)

قوم کی ترقی کی غرض سے یوروپ کی تہذیب وتمدن اور علوم وفنون کا مشاہدہ کرنے جب سر سید احمد انگلستان گئے تھے تو وہاں ان کو انگریزی کے قدیم اصلاحی پرچوں "ٹیٹلو"، "اسپکٹیٹو" اور "گارڈین" کے فائلوں کو دیکھا تو رچرڈ اسٹیل اور جازف ایڈیشن کے مضامین سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنی قوم کی اصلاح کے لیے اردو میں ایک ایسا ہی اصلاحی پرچہ نکالنے کا فیصلہ کرلیا۔ سرنامہ کا بلاک بھی لندن ہی میں تیار کروالیا۔ جب وہ واپس آئے تو کچھ دنوں (لگ بھگ تین ماہ بعد) کے بعد "تہذیب الاخلاق" کے نام سے ایک پرچہ جاری کیا۔ پہلا پرچہ ۲۴/دسمبر ۱۸۷۰ء کو شائع ہوا۔ یہ پرچہ سات جلدوں میں ایک سو آٹھ شمارے جاری کر کے ۲/ستمبر ۱۸۷۶ء کو بند ہوگیا۔ اس میں کل ۲۶۲ مضامین شائع ہوئے جن میں سے ۱۱۲ مضامین صرف سر سید احمد کے لکھے ہوئے تھے۔

تین سال بعد دوستوں اور ترقی پسند مسلمانون کے کہنے پر اسے دوبارہ ۲۳/

اپریل ۱۸۷۹ءکو جاری کیا گیا۔اس بار چار جلدوں میں کل ۶۷ مضامین تھے جن میں سے تیس مضامین سرسید احمد کے تھے۔۱۸/جولائی ۱۸۸۱ءکو یہ پھر بند ہو گیا۔

بارہ سال کی خاموشی کے بعد لوگوں کے اسرار پر یہ پھر ۱۷/اپریل ۱۸۹۴ء سے جاری ہوا۔اس تیسرے اور آخری دور میں تین جلدیں شائع ہوئیں اور ان تین جلدوں میں ۳۶ شمارے نکلے۔اس بار کل ۱۳۰ مضامین اس میں شامل ہوئے جن میں سے ۲۷ مضامین سرسید احمد کے تھے۔فروری ۱۸۹۷ء کے بعد اس کا اپنا کوئی وجود باقی نہ رہا۔یہ ''انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ'' کے اندر شامل کر دیا گیا۔سرسید کی وفات کے بعد ''تہذیب الاخلاق'' کا یہ نقش آخر بھی مٹ گیا۔ان کے انتقال کے بہت دنوں بعد دوسرے لوگوں نے اس رسالے کو پھر سے جاری کیا جو آج تک جاری ہے۔

''تہذیب الاخلاق'' جس مقصد کے لیے نکالا گیا تھا اس میں اس طرح کے مضامین یعنی مسلمانوں کی اصلاح کے لئے مضامین شائع ہوتے تھے۔اس پرچے کی ضخامت کی بھی کوئی حد مقرر نہ تھی۔عام طور پر آٹھ سے سولہ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔اس کے نکلنے کی تاریخ بھی متعین نہ تھی ماہ میں ایک بار کبھی دو بار اور کبھی تین بار بھی حسب ضرورت نکالا جاتا تھا۔اس پرچہ کے نکالنے کا مقصد ہی مسلمانوں کی ترقی، حسن معاشرت اور تہذیب کی ترقی تھا۔اس سلسلے میں عبداللہ خاں اس طرح رقم طراز ہوئے ہیں:

''اس پرچہ کے اجرا سے سرسید کا مقصود یہ تھا کہ مسلمانوں کی حسن معاشرت اور تہذیب کی ترقی ہو اور جو غلط ادہام مذہبی، اس کی ترقی کے مانع ہیں اور درحقیقت مذہب اسلام کے برخلاف ہیں ان کو رفع کیا جاوے اور اہل یورپ اور امریکہ کے اس اعتراض سے کہ اسلام جدید تمدن و ترقی کا دشمن ہے، جیسی برائیوں سے دامن پاک کیا جاوے۔ تنزلی کے باعث عادات و اخلاق میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں ان سے بطریق احسن مسلمانوں کو متنبہ کر کے ترقی پر مائل کیا جاوے۔ بیہودہ رسموں سے نفرت دلائی جاوے یونانیوں کی قدیم فرسودہ کتابیں جو ایک زمانہ ہوا کہ تقدیم پارینہ بن چکی ہیں مگر جن کا گہرا نقش مسلمانوں کے دلوں پر اب تک بیٹھا ہوا ہے۔ ان کی غلطیاں و اشگاف بیان کی جاویں۔ علوم جدید اور نت نئے فنون اور صنعتوں کو حاصل کرنے کی نوجوان مسلمانوں میں ایک لگن لگادی جاوے اور اس کے ساتھ ہی اپنے بزرگان اسلاف کی

عظمت اوصاف کے علمی اور عملی ناموں کی یاد بھی ان کے دلوں

میں زندہ رکھی جاوے۔''

(مقالات سر سید احمد خاں، مرتبہ محمد عبداللہ خاں، خویشگی، ص:۸)

اس پرچہ میں سرسید احمد خاں کے زیادہ تر مضامین شائع ہوئے۔ موضوع اور مواد کے لحاظ سے بھی یہ اہم ہیں۔

سرسید احمد خاں کے مضامین میں جہالت، تقلید پرستی، کاہلی، ریاکاری، تعصب، قومی نفاق، ظاہرداری، معاشرتی اصلاح، آزادئی رائے، تعلیم نسواں، قدیم تعلیم، خوداعتمادی، قومی ترقی، رسم ورواج، اپنی مدد آپ، ہمدردی، خوشامد، عورتوں کے حقوق، تربیت اطفال اور بحث وتکرار وغیرہ اہم ہیں۔ انہوں نے اپنے مضامین میں ہر طرح کے موضوعات کو اٹھایا ہے۔

اردو میں مضمون نگاری کی صنف کے باب بھی ہیں۔ ادب کی اس صنف کو انگریزی میں Essay کہا جاتا ہے جو یوروپ ہی سے حاصل ہوئی ہے۔

سرسید احمد کے سارے مضامین کو باقاعدہ Essay تو نہیں کہا جاسکتا لیکن مضامین کی کافی تعداد ایسی ہے جنہیں اس صنف میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ اچھا مضمون کسی

منصوبہ بندی یا پہلے سے مرتب کئے ہوئے خیالات کا محتاج نہیں ہوتا۔اس کی تہیں خود بخود کھلتی چلی جاتی ہیں۔ مثلاً ''امید کی خوشی'' گزرا ہوا زمانہ''،''سراب حیات''،''بحث وتکرار'' اور''رخصت'' وغیرہ۔ان مضامین میں تخیلات کا غلبہ ہے۔انہیں تخلیقی نثر کے زمرے میں بھی رکھا جاسکتا ہے۔سید عبداللہ اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

''سرسید کے بعض مضامین میں یہ خوبی پائی جاتی ہے مثلاً امید کی خوشی، بحث وتکرار اور گزرا ہوا زمانہ۔ان مضامین میں یہ خوبی پائی جاتی ہے کہ ان میں معلومات یقینی کی بجائے تخیلات کا غلبہ ہے۔یوں تو سرسید کے مضامین کی معلوماتی سطح عموماً کرخت ہوتی ہے مگر اچھے مضامین میں وہ تصویریں اور خوش نما نقوش تیار کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ مثلاً مضمون سراب حیات میں صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے سے ابتدا کی گئی ہے۔ اس کے بعد عمدہ مکالمہ آتا ہے۔ایک خیال سے دوسرا خیال پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔تصویریں بنتی جاتی ہیں۔ نقوش ابھرتے جاتے ہیں۔ پڑھنے والے کا دل مضمون کی تہوں میں الجھتا جاتا

ہے اور بات دل میں بیٹھتی جاتی ہے اور مجموعی تاثر پر مسرت ہوتا

ہے..... یہ ایک عمدہ مضمون کی بنیادی خوبی ہے اور یہ خوبی سید

صاحب کے بعض مضامین میں مل جاتی ہے۔''

(سر سید احمد اور ان کے نامور رفقا، سید عبداللہ، ص:۵۴)

سر سید احمد کے ایسے مضامین کو بعض لوگوں نے افسانے کے خانے میں بھی جگہ دے دی ہے۔ جس طرح ان کے دوسرے مضامین قوم کی اصلاح کی غرض ہی سے لکھے گئے ہیں لیکن ان میں تخیل سے زیادہ کام لیا گیا ہے جس طرح افسانے میں اصلاح کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور ہوتا ہے اسی طرح سر سید احمد کے اس طرح کے مضامین میں بھی اصلاح کا پہلو نمایاں ہے ساتھ ہی افسانوی رنگ بھی موجود ہے۔ اس اقتباس کو دیکھئے:

''وہ پہلا گنہ گار انسان جب شیطان کے چنگل میں پھنسا اور تمام نیکیوں نے اس کو چھوڑا اور تمام بدیوں نے اس کو گھیرا تو صرف تو ہی اس کے ساتھ رہی۔ تو ہی نے اس ناامید کو ناامید ہونے نہیں دیا۔ تو ہی نے اس موت میں پھنسے دل کو مرنے نہیں دیا۔ تو ہی نے اس کو اس ذات سے نکالا اور پھر اس کو اسی اعلیٰ

درجے پر پہنچایا، جہاں کہ فرشتوں نے اس کو سجدہ کیا تھا۔

اس نیک نبی کو جس نے سینکڑوں برس اپنی قوم کے

ہاتھ سے مصیبت اٹھائی اور مار پیٹ سہی، تیرا ہی خوبصورت

چہرہ تسلی دینے والا تھا۔ وہ پہلا ناخدا جب کہ طوفان کی موجوں

میں بہا جاتا تھا اور بجز مایوسی کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا تو تو ہی اس

طوفان میں اس کی کشتی کھینے والی اور اس کا بیڑا پار لگانے والی

تھی۔“

(انتخاب مضامین سرسید، مرتبہ آل احمد سرور، ص:۸۹)

سرسید احمد خاں کے بہت سے مضامین میں بعض کمزوریاں بھی پائی جاتی ہیں۔ جن کی وجہ سے ان کے کچھ مضامین کو معیاری مضامین کی صف میں جگہ نہیں دی جاسکتی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ان کے کچھ مضامین طویل ہیں دوسرے یہ کہ ان میں علمی واصلاحی معلومات کی اتنی زیادتی ہے کہ مضمون پر لطف نہیں رہ پاتے۔ ساتھ ہی اس میں منصوبہ بندی بھی بے حد سخت ہوتی ہے جس سے قاری کے ذہن پر بوجھ بڑھتا ہے۔ علمی مقالات یا علمی بحث کے اعتبار سے ان پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا مگر مضمون کی سی شگفتگی ان میں

نہیں پائی جاتی:

''تربیت یافتہ ملک اس بات پر بہت غل مچاتے ہیں کہ عورت اور مرد دونوں باعتبار آفرینش کے مساوی ہیں اور دونوں برابر حق رکھتے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ عورتوں کو مردوں سے کم اور حقیر سمجھا جائے۔ اگر تمثیلاً کہا جائے کہ عورت انسان کے لئے بمنزلہ بائیں ہاتھ کے ہے اور مرد بمنزلہ دائیں ہاتھ کے یا قدر و قیمت میں عورت بمنزلہ سولہ آنے کے ہے اور مرد بمنزلہ روپیہ کے تو بھی اس پر راضی نہیں ہوتے۔ بایں ہمہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس قدر قدر و منزلت عورتوں کی مذہب اسلام میں کی گئی ہے اور ان کے حقوق اور ان کے اختیارات کو مردوں کے برابر کیا گیا ہے اس قدر آج تک کسی تربیت یافتہ ملک میں نہیں ہے۔''

(انتخاب مضامین سرسید، مرتبہ آل احمد سرور، ص:۵۲)

اس کے علاوہ سرسید کے مضامین میں بے حد سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ زیادہ تر مضامین میں ان کی حیثیت معلم اخلاق کی ہے ادیب کی نہیں۔ وہ اخلاق و اقدار کو مادی

مفرقوں اور متفقوں کے حوالے سے پیش کرتے ہیں۔ وہ انسانی ضمیر کو للکار کر یا اخلاقی جذبے کو ابھار کر نیک و بد کا امتیاز نہیں سکھاتے۔ زندگی کی وہ تصویریں بھی وہ نہیں پیش کرتے جن کو دیکھنے کے بعد وجدان خود ہی فیصلہ کردے کہ نیکی نیکی ہے اور بدی تو بدی ہی ہے۔ نیکی کا مقابلہ بدی سے نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح انسان سے سہواً خطا کا ہونا بھی ممکن ہے۔ لکھتے ہیں:

''انسانوں کی سمجھ پر بڑا افسوس ہے کہ جس قدر وہ اپنے خیال و قیاس میں اپنے سے اس مشہور مقولے کی سند پر کہ ''الانسان مرکب من الخطاء والنسیان'' سہواً خطا کا ہونا ممکن سمجھتے ہیں اس قدر اپنی رایوں اور اپنی باتوں کے عمل درآمد میں نہیں سمجھتے ان کی عملی باتوں سے اس کی قدر و منزلت نہایت ہی خفیف معلوم ہوتی ہے۔ گو خیال میں اس کی کیسی ہی قدر و منزلت سمجھتے ہوں۔ اگرچہ سب اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ہم سے سہواً خطا ہوئی ممکن ہے۔ مگر بہت ہی کم آدمی ایسے ہوں گے جو اس کا خیال رکھنا اور از روئے عمل کے بھی اس کی احتیاط کرنا ضروری

سمجھتے ہوں اور عملی طور پر اس بات کو تسلیم کرتے ہوں کہ جس

رائے کی صحت کا ان کو خوب یقین ہے شاید وہ اسی سہواً خطا کی

مثال ہو جس کا ہونا وہ اپنے سے ممکن سمجھتے ہیں۔"

((انتخاب مضامین سر سید، مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور، ص:۱۴۲))

سر سید احمد کے زیادہ تر مضامین کی اس کمزوریوں اور کمیوں کا سبب یہ ہے کہ وہ مصلح تھے۔ انہوں نے اپنی قوم کی اصلاح کے لیے ادبی ذرائع پر زیادہ اعتماد نہیں کیا۔ مان لیا جائے کہ ادب اور اخلاق میں فرق نہیں ہوتا مگر اخلاق کی کھلی تلقین ایک غیر ادبی طریقہ کہا جا سکتا ہے۔ مغربی بلند پایہ مضمون نگار پہلے ادیب تھے پھر مصلح، مگر سر سید احمد پہلے مصلح تھے پھر مضمون نگار۔ بہر حال یہ سب طریقہ اپنے مضمون میں استعمال کرنا ان کا مقصد تھا اور وقت و حالات کی ضرورت بھی۔ انہوں نے اپنے مضامین میں اخلاق کا جو فلسفہ پیش کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پیش نظر عملیت اور مقصدیت ہے۔ سید عبداللہ کے مطابق:

"سر سید کے مضامین میں جو فلسفہ اخلاق پیش ہوا ہے اس کی

غایت "عملیت" اور "مقصدیت" ہے۔ ان کے نزدیک جو

شے دنیاوی طور پر مفید نہیں وہ اچھی بھی نہیں۔ تہذیب نفس اور

مجلسی شائستگی ان کے ضابطہ واخلاق میں ایک اہم قدر ہے۔

سرسید کے اخلاقی خیالات پر امام غزالی کی تعلیمات کا بھی عکس

پڑا ہے مگر وہ امام غزالی کی صرف منطق اور عقلی تطبیق کے مداح

معلوم ہوتے ہیں۔غزالی کی روحانیت سے انہیں کوئی خاص

دلچسپی معلوم نہیں ہوتی۔اس منطق پسندی نے ان کے مضامین

کو خشک بنادیا ہے۔''

(سرسید اوران کے نامور رفقا،سید عبداللہ،ص:۵۵)

سرسید احمد خاں ایڈیشن سے متاثر ہوکر مضمون نگاری شروع کی تھی لیکن ان کے مضامین میں روح کی وہ تازگی نہیں ملتی جو ایڈیشن کے مضامین میں ہیں۔کچھ مضامین کو چھوڑ کر سرسید احمد کے مضامین میں ظرافت کے وہ انداز نہیں ملتے جس سے طبیعت میں شگفتگی پیدا ہو۔ان کے یہاں تصورات اور معقولات کا غلبہ ہے۔زندگی کی خوش نما اور دلچسپ تصویریں کم ہیں۔اعمال انسانی اوران کے مادی فائدے اور نقصانات کی معقول توجیہوں پر وہ زیادہ زور دیتے ہیں۔وہ نیچر کے دلدادہ اور استدلال کے قائل نظر آتے ہیں۔بقول سید عبداللہ:

''ان سب باتوں کے باوجود سرسید اردو کے اولین مضمون نگار

ہیں۔اولین اس معنی میں کہ انہوں نے سب سے پہلے شعوری

طور پر مضمون یاEssay کی صنف کواختیار کیا اور براہ راست

انگریزی زبان کے مضمون نگاروں سے اثر قبول کیا اور آنے

والے مضمون نگاروں کے لئے شاہراہیں متعین کیں اور اس

میں کچھ شبہ نہیں کہ انہوں نے اپنے پرچہ تہذیب الاخلاق کے

ذریعہ ہندوستان کے تعلق میں (خصوصاً اردو کی سادہ نثر کی

ترویج کے معاملہ میں) تقریباً ویسی ہی خدمات انجام دیں۔

جیسی انگلستان میں ایڈیسن اور سٹیل نے اسپکٹیٹر اور ٹیٹلر کے

ذریعے انجام دی تھیں۔''

(سرسیداوران کے نامور رفقا، سیدعبداللہ، ص:۵۶)

سرسید احمد کا خیال تھا کہ تحریر سادہ ہونی چاہئے، لطف مضمون میں ہوا سکے ادا

میں نہیں اور جو بات اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں بھی پڑے۔یعنی وہی

مضمون ادا کئے جائیں جن میں سچائی ہو، بناوٹ نہ ہو، اداکاری نہ ہو۔یعنی سادگی، بے

تکلفی اور مدعا نویسی کو سر سید احمد نے نیچرل طرز بیان سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی ایسا طرز بیان ہو جو قاری اور مصنف دونوں کی طبیعت کے لیے مانوس ہو اور اس میں آورد، تکلف اور بناوٹ نہ ہو۔ انہوں نے ''تہذیب الاخلاق'' کے ایک مضمون میں لکھا ہے:

''علم و ادب و انشاء کی خوبی صرف لفظوں کو جمع کرنے اور ہم وزن اور قریب التلفظ کلموں کی تُک ملانے اور دوراز کار خیالات بیان کرنے اور مبالغہ آمیز باتوں کے لکھنے پر منحصر ہے۔ یہاں تک کہ دوستانہ خط و کتابت اور چھوٹے چھوٹے روز مرہ کے رقعوں میں یہ سب برائیاں بھری ہوئی ہیں۔ کوئی خط یا رقعہ ایسا نہ ہوگا جس میں جھوٹ اور وہ بات جو حقیقت دل میں نہیں ہے مندرج نہ ہو۔ پس ایسی طرز تحریر نے تحریر کا اثر ہمارے دلوں سے کھو دیا ہے۔ اور ہم کو جھوٹی اور بناوٹی تحریر کا عادی بنا دیا ہے۔ (مضامین تہذیب الاخلاق جلد۲، ص: ۴۴۷)

سر سید کے یہ خیالات قدیم طرز نگارش کی تنقید بھی ہے اور نئے اسلوب بیان کے لئے دستور العمل بھی۔ ان سے یہ واضح ہوتا

ہے کہ انہوں نے اپنے اسلوب میں کن کن باتوں کو مدنظر

رکھا۔''

(سرسید اوران کے نامور رفقا، سید عبداللہ، ص:۵۹)

سرسید کی مضمون نگاری میں تلقین اور ترغیب پائی جاتی ہے۔ ایک اچھے مقالہ میں ذاتی نقطۂ نظر کوئی عیب نہیں ہے۔ مگر ذاتی نقطہ نظر اور واعظانہ تلقین میں فرق ہے۔ تلقین مقالے کی دلچسپی کو کم کر دیتا ہے اور اس کا وصف کم ہو جاتا ہے۔ بلکہ یہ ایک مقصدی خطبہ بن جاتا ہے اور اگر اس میں لفظوں کی درستی اور لب ولہجہ کی تندی کا اضافہ ہو جائے تو مضمون کا لطف بے حد کمزور پڑ جاتا ہے۔

اس سلسلے میں سید عبداللہ کی اس بات سے بہت حد تک اتفاق کیا جاسکتا ہے:

''سرسید کے مقالات کی زبان عام فہم ضرور ہے۔ ان کا انداز بیان بھی گفتگو کا انداز بیان ہے مگر سنجیدگی اور متانت نے شگفتگی پیدا نہیں ہونے دی۔ البتہ ایسے مقالات جن میں ترغیبی عنصر کی کمی ہے یا جہاں جوش انگیزی مقصود نہیں ان میں انہوں نے مضمون نویسی کا اچھا معیار قائم کیا ہے مثلاً مضمون تعصب،

تکمیل، گزرا ہوا زمانہ وغیرہ ہیں یا رسم و رواج کی پابندی کے

نقصانات یا تہذیب یا سویلزیشن یا بحث و تکرار۔ مگر جہاں

جوش و خروش کی کیفیت ہے وہاں ان کے مضامین (خصوصاً

لمبے ہو جائیں تو) توازن کھو بیٹھتے ہیں اور ان کے عام مضمون

اعلیٰ اور بہترین مضامین کی صف میں نہیں رکھے جا سکتے۔ البتہ

اعلیٰ مقالات کی حیثیت سے بعض اوقات وہ لائق تحسین

ہو جاتے ہیں۔''

(سرسید اور ان کے نامور رفقا، سید عبداللہ، ص:٦٦)

جہاں تک سرسید احمد کے مضامین کے موضوعات کا سوال ہے تو ان کے دور میں مسلمانوں کا زوال اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ مغلیہ حکومت کے خاتمے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے اقتدار کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ ١٨٥٧ء کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمان انگریز حاکموں کے غیظ و غضب کا نشانہ بنے۔ ان کے ہاتھ سے زمینداری، جاگیر داری اور دوسرے بڑے عہدے جاتے رہے۔ نئی انگریز حکومت مسلمانوں کی طرف سے بدگمان ہو گئی اور انہیں اپنا حریف سمجھنے لگی۔ انہیں یہ خطرہ لاحق تھا کہ مسلمان اپنی کھوئی ہوئی

حکومت حاصل کرنے کے لئے کہیں دوبارہ صف آرا نہ ہو جائیں۔ اس لیے وہ انہیں پوری طرح دبا دینا چاہتی تھی۔ اس لئے انہیں ہر بڑے عہدے سے محروم کر دیا گیا۔ اس جنگ میں جن لوگوں نے حصہ لیا تھا انہیں تو پوری طرح برباد ہی کر دیا گیا۔ لیکن جن کی وفاداری پر ذرا بھی شک تھا ان کی جاگیریں اور جائیدادیں بھی ضبط کر لی گئیں۔ جس کے نتیجے میں مسلمان اقتصادی طور پر کمزور ہو گئے۔ غریبوں کی حالت تو اور بھی ابتر ہو گئی۔ آسودہ حال بھی ایک طرح سے محتاج ہو گئے۔ بڑی بڑی حویلیاں اور محل سرائیں تباہ و برباد ہو کر کھنڈر ہو گئیں۔

سر سید احمد کے بہت سے مضامین کا موضوع مسلمانوں کی تباہی ہے۔ دوسری قوموں کی حالت اتنی تباہ نہ تھی جتنی مسلمانوں کی تھی۔ مسلمانوں کا ایک محدود طبقہ آسودہ حال تھا وہ بھی بہت طرح کی لعنتوں میں مبتلا تھا۔ سر سید احمد خاں نے ایک جگہ فرمایا ہے کہ ایک نواب زادے کو جو دیکھا جو غدر میں تباہ ہوا تھا تو ہم کو شبہ ہوا کہ کوئی تمبا کو فروش ہے۔ ہم نے بادشاہ زادے بھی دیکھے ہیں جو گولا کبوتر کو سیٹی پر لگائے اور طویل طوطوں کو پنجڑوں پر اڑانے اور بٹیروں کو لڑانے کے سوائے اور کوئی نشان شاہزادگی نہ رکھتے تھے۔

مسلمانوں کی جہالت کو موضوع بنا کر سر سید خاں نے کئی مضامین لکھے۔ ان کا خیال تھا جو علوم مسلمانوں میں رائج ہیں وہ بلاشبہ غیر مفید ہیں اور ان کی مفلسی اور محتاجی کا

باعث بھی یہی ہے۔ مفلسی کا اصل سبب جہل ہے اور غیر مفید علوم کا عام اور جاہل دونوں برابر ہیں۔ اس لیے ایسے غیر مفید علوم سے نہ لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے اور نہ خود وہ اپنا کچھ بھلا کر سکتے ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو جہالت سے نکلنے اور نئے علوم سے واقف ہونے پر زیادہ زور دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''جیسا کہ ایک عقل مند آدمی کا قول ہے اگر حسب احتیاج وقت لوگوں کی تعلیم وتربیت نہ ہوتو اس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ لوگ اول مفلس اور محتاج اور پھر نالایق اور کاہل اور پھر ذلیل وخوار اور پھر چور بدمعاش ہوجاتے ہیں۔ جدید تعلیم سے بیزاری مسلمانوں کی اقتصادی اور معاشرتی حالت کو بد سے بدتر کیے دے رہی تھی۔ اس صورت حال کا خود مسلمانوں کو تو پوری طرح اندازہ نہیں تھا لیکن دوسری قوموں کے روشن خیال اصحاب کو خیال تھا کہ مسلمانوں کی یہ غفلت انہیں بالکل تباہ کردے گی۔ ڈبلیو، ڈبلیو، ہنٹر نے اپنی کتاب ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' میں جا بجا مسلمانوں کی زبوں حالی کا ذکر کیا ہے جو چھوٹی چھوٹی

نوکریوں کو ترستے تھے اور اپنی غربت کو دور کرنے کی کوئی تدبیر

نہ کرپاتے تھے۔''

(سرسید اور ہندوستانی مسلمان، نورالحسن نقوی، ص:۱۳۶)

سرسید احمد نے مسلمانوں کے غلط عقائد کو بھی موضوع بنایا ہے۔ دراصل اس وقت مسلمانوں نے فروعات کو اصل دین سمجھ لیا تھا۔ گمراہ کن عقائد اور مزموم رسموں کی پیروی کو مسلمان اپنی نجات کا ذریعہ سمجھنے لگے تھے۔ بہت سی بری عادتوں نے مسلمانوں کو توہم پرست بنا دیا تھا۔ اس لیے یہ قوم جہد وعمل کی قوت سے محروم ہوگئی تھی۔ لباس، رہن، سہن اور خورد ونوش کے سلسلے میں مذہب کے نام پر ایسی عادتوں کا رواج ہوگیا تھا جن سے مذہب کا دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ سرسید احمد نے مسلمانوں کو اس بدعت اور غلط رسم ورواج سے روکنے کی کوشش کی۔

سرسید احمد نے غلط رسم ورواج کو موضوع بنا کر ''رسم ورواج'' کے نام سے ایک گراں قدر مضمون لکھا ہے۔ آنکھیں بند کر کے رسم ورواج پر عمل پیرا ہونے کو وہ بندر کی طرح نقل کرنے سے تشبیہ دیتے ہیں۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ اچھا آدمی وہی ہے جو بری رسموں کو رد کرنے اور اچھی رسموں کو اختیار کرنے کا شعور رکھتا ہو۔ اس وقت پڑھے

لکھے اور جاہل سب غلط رسم و رواج میں مبتلا تھے۔ سر سید احمد خود ہی لکھتے ہیں:

"تعجب یہ ہے کہ جاہل اور عالم، نادان اور عقلمند سب برابر اس کی غلامی کرتے ہیں۔ اچھا قابل اور لائق آدمی جو فلاسفی اور حکمت کے باریک سے باریک مسئلے حل کرتا ہے۔ جب ان باتوں تک پہونچتا ہے، جن کا رسم و رواج مدت سے چلا آتا ہے تو تمام اپنی قابلیت اور عقل و تمیز کو بھول جاتا ہے۔ اور محض نادان شخص کی اس کے آگے سر جھکا لیتا ہے۔ کس قدر ہم کو تعجب آتا ہے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ سقراط جیسا شخص جس نے اپنی قوم کے ریفارم کرنے میں اپنی جان دے دی جبکہ زہر کے پیالہ کا اپنی جان کا اثر پاتا ہے اور اپنی زندگی کو چند لمحہ سے زیادہ نہیں سمجھا اس وقت اپنے پیارے دوست کریٹر کو وصیت کرتا ہے کہ وہ اس کی منت کو جو اس کو ایسی اس دیوا پر مرغی چڑھانے کی تھی پوری کرے۔"

(مقالات سر سید، مرتبہ محمد عبداللہ خاں خود شیتگی، ص:۸۵)

سر سید احمد خاں نے کتنا درست فرمایا ہے۔ یہ کہنا بہت حد تک درست ہے کہ

رسم ورواج کے بہت سے طریقے بزرگوں کے ہزار ہا برس کے تجربے کے نتیجے میں وجود میں آتے ہیں لیکن یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ جن حالات میں یہ رسمیں پیدا ہوئی تھیں اب وہ باقی بھی ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں تو اس طرح کے رواج سے ہمیں فائدہ پہنچانے کے بجائے نقصان میں ڈال دیں گی۔

سرسید احمد خاں نے اپنے مضامین میں کاہلی کو بھی موضوع بنایا ہے۔ وہ اپنی قوم کو بتانا چاہتے تھے کہ کاہلی صرف ہاتھ پاؤں سے محنت نہ کرنے، کام کاج میں چستی پھرتی نہ دکھانے اور ہر جگہ سستی کا مظاہرہ کرنا ہی کاہلی نہیں ہے بلکہ وہ دلی قویٰ کو بیکار چھوڑ دینے کو سب سے بڑی کاہلی سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں:

> ''ہم اپنے وطنوں سے یہ کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جو ہم کو اپنے قوائے دلی اور قوت عقلی کو کام میں لانے کا موقع نہیں رہا ہے اس کا بھی سبب یہی ہے کہ ہم نے کاہلی اختیار کی ہے یعنی اپنے دلی قویٰ کو بے کار چھوڑ دیا ہے۔ اگر ہم کو قوائے قلبی اور قوت عقلی کے کام میں لانے کا موقع نہیں ہے تو ہم کو اسی کی فکر اور کوشش چاہئے کہ وہ موقع کیونکر حاصل ہو۔ اگر اس کے

حاصل کرنے میں ہمارا کچھ قصور ہے تو اسی کی فکر اور کوشش چاہئے کہ وہ قصور کیوں کر رفع ہو۔ غرض کہ کسی شخص کے دل کو بیکار پڑا رہنا نہ چاہئے۔ کسی نہ کسی بات کی فکر و کوشش میں مصروف رہنا لازم ہے تا کہ ہم کو اپنی تمام ضروریات کے انجام کرنے کی فکر اور مستعدی رہے اور جب تک کہ ہماری قوم سے کاہلی یعنی دل کا بیکار پڑے رہنا نہ چھوٹے گا اس وقت تک ہم کو اپنی قوم کی بہتری کی توقع کچھ نہیں ہے نہایت حکیمانہ قول ہے کہ:

بے کار مباش کچھ کیا کر　　　گر نہ کر سکے تو کچھ کہا کر

(انتخاب مضامین سرسید، پروفیسر آل احمد سرور، ص:۵۹)

سرسید احمد خوشامد کو بھی موضوع بنا کر قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک ایک خوشامد دل کی ساری بیماریوں سے زیادہ مہلک ہے۔ جو اس بیماری میں مبتلا ہو گیا اس کے اندر ایک زہریلا مادہ پیدا ہو گیا۔ خوشامد ایک ایسی بلا ہے جس میں مبتلا ہو کر آدمی آسانی سے خود غرضوں اور مطلب پرستوں کے مکر و فریب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جو خوبیاں انسان کے اندر نہیں ہوتی ہیں وہ خوشامدی ان کے اندر بتانے کی کوشش کرتا ہے اور

انسان دل ہی دل میں خوش ہو جاتا ہے۔اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اندر اوصاف پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتا اور غیر مہذب رہ جاتا ہے۔سر سید احمد فرماتے ہیں:

"لیکن اگر ہر شخص کو یہ بات معلوم ہو جاوے کہ خوشامد کا شوق کیسے نالائق اور کمینہ سببوں سے پیدا ہوتا ہے تو یقینی خوشامد کی خواہش کرنے والا بھی ویسا ہی نالائق اور کمینہ متصور ہونے لگے گا جب کہ ہم کو کسی ایسے وصف کا شوق پیدا ہوتا ہے جو ہم میں نہیں ہے یا ہم ایسے بننا چاہتے ہیں جیسے کہ در حقیقت ہم نہیں ہیں تب ہم اپنے تئیں خوشامدیوں کے حوالہ کرتے ہیں جو اوروں کے اوصاف اور اوروں کی خوبیاں ہم میں لگانے لگتے ہیں۔ گو بسبب اس کمینہ شوق کے اس خوشامدی کی باتیں ہم کو اچھی لگتی ہیں مگر در حقیقت وہ ہم کو ایسی ہی بدزیب ہیں جیسے کہ دوسروں کے کپڑے جو ہمارے بدن پر کسی طرح ٹھیک نہیں۔ اس بات سے ہم اپنی حقیقت کو چھوڑ کر دوسرے کے اوصاف اپنے میں سمجھنے لگیں۔ یہ بات نہایت عمدہ ہے کہ ہم خود اپنی

حقیقت کو درست کریں اور سچ مچ وہ اوصاف خود اپنے میں پیدا

کریں۔"

(انتخاب مضامین سرسید، پروفیسر آل احمد سرور، ص:۷۷)

سرسید احمد خاں کو اس بات کا احساس تھا کہ اس سے پوری قوم تباہ ہو جائے گی اور خاص طور پر ہماری قوم۔ یہی وہ موذی مرض ہے جس نے بادشاہوں اور امیروں کو تن آسان بنا دیا۔

سرسید احمد کے مضامین کے موضوعات میں قومی نفاق، ظاہر داری، ناشائستہ گفتگو، تعصب، مذہبی عقائد کی درستی اور آزادئ رائے وغیرہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انہوں نے قومی نفاق کو بدترین گناہ سے تعبیر کیا ہے۔ وہ اپنی قوم کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ نا اتفاقی کو قرار دیتے تھے۔ ان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ لوگ اپنے اپنے عقائد ترک کر کے کسی ایک عقیدے پر قائم ہو جائیں بلکہ وہ چاہتے تھے کہ قومی بھلائی کے کاموں میں سب متفق ہوں:

''ظاہر داری'' سرسید احمد کا ایسا مضمون ہے جس میں انہوں نے ظاہر داری کو موضوع بناتے ہوئے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ ایک ایسا عیب تھا جس نے بیشتر مسلمانوں کو

اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ بات چیت، برتاؤ، خط وکتابت غرض ہر جگہ ظاہر داری کا بول بالا تھا جس کی وجہ سے قوم کا وقار مجروح ہو رہا تھا۔ سر سید احمد نے ظاہر داری کی خرابیوں کو اجاگر کرتے ہوئے اپنی قوم کو اس سے دور رہنے کا مشورہ دیا۔

سر سید احمد ناشائستہ گفتگو کرنے والے لوگوں سے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے اسے بھی اپنے مضمون کا موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے اس وقت گفتگو میں استعمال ہونے والے ناشائستہ الفاظ کی سخت نکتہ چینی کی ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ دوران گفتگو اچھی اور شائستہ گفتگو کرنی چاہئے تاکہ اردگرد موجودہ لوگوں پر اس کا اچھا اثر پڑے۔ وہ مصنوعی زبان استعمال کرنے والوں کے بھی خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا زبان ایسی ہونی چاہئے جو لوگوں کے دل و دماغ پر اچھا اثر ڈالے۔ بھدے الفاظ کے استعمال سے انہوں نے لوگوں کو روکا۔ مقفیٰ اور مسجع عبارت کی خرابی سے بھی آگاہ کیا۔ انہوں نے جھوٹی شاعری کے عیوب پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

سر سید احمد خاں نے قوم کے اندر پھیلے ہوئے بے شمار عیوب کی طرف بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ لوگ اپنے باپ دادا کے کارناموں پر فخر تو کرتے ہیں لیکن ان کے نقش قدم پر چل کر قابل ذکر کارنامے انجام نہیں دیتے۔ نتیجہ کے طور پر پوری قوم بے

عملی کا شکار ہو جاتی ہے۔ دراصل سرسید کا مقصد ہی قوم کی اصلاح کرنا تھا۔ اس مقصد سے انہوں نے ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا تھا۔ مسلمانوں کی زندگی کے ہر گوشے پر سرسید کی نظر تھی۔ وہ اپنی پوری قوم کو ان کی خوبیوں اور خامیوں سے آگاہ کرتے رہے۔ وہ آزادئ رائے کے قائل تھے۔ ان کے خیال میں اگر انسان کو آزادانہ رائے دینے اور آزادانہ رائے جاننے اور غور کرنے کا کھلا ہوا ذہن حاصل ہو جائے تو دنیا کی آدھی خرابیاں خود ہی دور ہو جائیں گی۔ یہ سچ ہے کہ آزادئ رائے کو سب سے زیادہ نقصان مذہبی تعصب سے پہنچا ہے اور آج بھی پہنچ رہا ہے۔ کسی مذہب پر اگر اعتراض کیا جاتا ہے تو اس مذہب کے ماننے والوں کے جذبات مشتعل ہوتے ہیں اور اس اعتراضات کو سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے ہیں۔ خاص کر یہ برائی مسلمانوں میں زیادہ ہے۔

مذہبی عقائد کی درستگی کی طرف بھی سرسید کو متوجہ ہونا پڑا۔ اس کے بغیر معاشرے کا اصلاح ممکن نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے اس موضوع کو بھی اپنے مضمون کا ذریعہ بنایا۔ مسلمانوں میں بہت سی بری رسمیں اور بری عادتیں رائج ہو چکی تھیں لوگ انہیں مذہب کا جز سمجھنے لگے تھے۔ اس لیے سرسید احمد کو مجبوراً مذہبی بحث کا آغاز کرنا پڑا۔

سرسید کو سب سے زیادہ فکر مسلمانوں کے عصری علوم سے تھا۔ وہ اپنی تقریروں

اور تحریروں میں کہا کرتے تھے کہ قوم کے سارے امراض کا علاج تعلیم ہے۔ وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کو بھی ضروری قرار دیتے تھے لیکن دونوں کو ایک دوسرے کا جز تصور کرتے تھے۔ لکھتے ہیں:

''نہایت عمدہ قول ہے کہ کتابوں کا پڑھا دینا تو تعلیم کا نہایت ادنیٰ اور سب سے زیادہ حقیر جزو ہے۔ بلکہ اس قسم کے بہت سے پڑھنے سے جس میں اندرونی قویٰ کی تحریک اور شگفتگی نہ ہو۔ جس قدر دل کے قویٰ کمزور اور نا کارہ ہو جاتے ہیں ایسے اور کسی چیز سے نہیں ہوتے۔ ہم اپنے ہاں کے عالموں کا حال بالکل یہی دیکھتے ہیں ان کے روحانی قویٰ بالکل نیست و نابود ہو جاتے ہیں اور صرف زبانی بک بک یا تکبر و غرور اور اپنے آپ کو بے مثل و بے نظیر اور قابل ادب سمجھنے کے اور کچھ باقی نہیں رہتا۔ زندہ ہوتے ہیں مگر دلی اور روحانی قویٰ، شگفتگی کے اعتبار سے بالکل مردہ ہوتے ہیں۔ کتابیں پڑھتے ہیں اور جس قدر عمدہ کتابیں افراط سے بہم پہنچیں ان کو اور زیادہ پڑھتے ہیں

اور ان سے تربیت حاصل کرتے ہیں اور ایسے بیل کی مانند

ہوجاتے ہیں جو برابر چرتا ہے اور پھر بھی چراگاہ ہی میں رہنے

کی خواہش کرتا ہے۔ پس کتابیں پڑھ لینے سے انسانیت نہیں

آجاتی بلکہ وہ کتابی علم خود ان پر بوجھ ہوتا ہے۔"

(انتخاب مضامین سرسید، پروفیسر آل احمد سرور، ص:۵۵)

سرسید احمد مغربی تعلیم کو حاصل کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جو قوم وقت اور حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیتی ہے اور جس ملک کی جو سرکاری زبان ہوتی ہے اسے اچھی طرح جان لیتی ہے اس قوم کا مقام بلند ہوجاتا ہے۔ وہ اچھی تعلیم اور اچھی تربیت کے لئے بچوں کو گھر کے ماحول سے دور رکھ کر ایسے مقامات پر تعلیم دلوانے کو اچھا سمجھتے تھے جہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ کھیل کود، ورزش، یکساں لباس، یکساں کھانا اور یکساں ضبط اوقات ہو۔ یعنی وہ ہاسٹل لائف کا مکمل خاکہ ذہن میں رکھتے تھے۔ آگے چل کر محمڈن کالج میں اسے بروئے کار لانے کا انہیں موقع ملا۔

سرسید احمد خاں خواتین کی تعلیم کو بھی بے حد اہمیت دیتے تھے۔ ان کی تعلیم کو وہ ضروری قرار دیتے تھے لیکن مرد کی تعلیم کے بعد۔ ان کا کہنا تھا کہ جب تک مرد تعلیم یافتہ نہ

ہوں گے عورتوں کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں کی جاسکتی۔ وہ یاد دلاتے تھے کہ تاریخ عالم میں ایسی کوئی مثال موجود نہیں ہے کہ مرد تعلیم یافتہ نہ ہوں اور عورتیں تعلیم یافتہ ہوگئی ہوں۔ یا مرد تعلیم یافتہ ہوں اور انہوں نے عورتوں کی طرف توجہ نہ کی ہو۔ مختصر یہ کہ سرسید نے اپنی ساری زندگی مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت کے لئے وقف کردی تھی۔ نورالحسن نقوی لکھتے ہیں:

''انہوں نے اپنی ساری زندگی مسلمانوں میں جدید تعلیم کی اشاعت کے لیے وقف کردی تھی۔ اسی مقصد سے انہوں نے انگلستان کا سفر کرکے وہاں کے طریق تعلیم کا مطالعہ کیا۔ اسی کام کی تکمیل کے لئے انہوں نے پیرانہ سالی اور علالت میں دور دراز کا سفر کرکے چندہ فراہم کیا۔ اپنے تعلیمی مشن کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے اپنوں بیگانوں کے آگے ہاتھ پھیلایا، کتابیں چھاپیں، لاٹری کھولی، سوانگ رچایا، نمائش میں دکان لگائی اور جتنی تدبیریں ہوسکتی تھیں وہ بھی کیں۔''

(سرسید اور ہندوستانی مسلمان۔ نورالحسن نقوی، ص:۱۵۱)

سر سید احمد وقت کی پابندی، طرز گفتگو صفائی اور لباس جیسے موضوعات پر بھی مضامین لکھے ہیں۔ یہ تو صحیح ہے کہ وقت کی پابندی ضروری ہے۔ ساری قوم کو اس کی پابندی کرنی چاہئے۔

گفتگو میں سادگی اور شائستگی ہونی چاہئے۔ الفاظ کا انتخاب لب ولہجہ، گفتگو کے دوران حرکات وسکنات وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو مہذب یا غیر مہذب ہونے کا پتہ دیتی ہیں۔ جس طرح طرز گفتگو انسان کو شائستہ بناتی ہے اس طرح صفائی اور اچھے لباس سے بھی انسان کے شائستہ یا غیر شائستہ ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ مسلمانوں کا مذہب اعلیٰ درجے کی صفائی کی تلقین کرتا ہے۔ لباس کے مسئلہ پر بھی سر سید احمد نے کئی بار بحث کی ہے۔ وہ اچھے لباس کو شائستگی کی علامت خیال کرتے تھے۔ طرز گفتگو پر تو خاص توجہ دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انسان اپنی گفتگو ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ کسی بات پر ضد کرنا، اپنی بات پر اڑے رہنا، دوسروں کی باتوں کو اہمیت نہ دینا، یہ سب ان کے نزدیک برے فعل سے کم نہ تھا۔ ''بحث وتکرار'' کے عنوان سے انہوں نے ایک مضمون بھی لکھا تھا جو خاصا مقبول بھی ہوا تھا۔ اس سلسلے میں ان کے مضمون کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

''جب کہ تم مجلس میں ہو جہاں مختلف رائے کے آدمی ملے

ہوئے ہیں تو جہاں تک ممکن ہو جھگڑے اور تکرار اور مباحثہ کو

آنے مت دو کیوں کو جب تقریر بڑھ جاتی ہے تو دونوں کو

ناراض کر دیتی ہے۔ جب دیکھو کہ تقریر لمبی ہوتی جاتی ہے اور

تیزی اور زور سے تقریر ہونے لگتی ہے تو جس قدر جلد ممکن ہو،

اس کو ختم کرو۔ اور آپس میں ہنسی خوشی مذاق کی باتوں سے دل کو

ٹھنڈا کرلو۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ہم وطن اس بات پر غور

کریں کہ ان کی مجلسوں میں آپس کے مباحثہ اور تکرار کا انجام

کیا ہوتا ہے۔''

(انتخاب مضامین سرسید۔ مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور، ص:۸۷)

سر سید احمد خاں نے دین اور دنیا کی تفریق کو بھی موضوع بنایا ہے۔ سرسید کے عہد میں مسلمان مادی ترقی کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور دنیاوی نعمتوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور آخرت ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے۔ وہ بار بار اس بات پر زور دیتے تھے کہ تنگی میں زندگی گزارنے والا بھی نجات ابدی حاصل کر سکتا ہے اور لاکھوں کروڑوں روپئے جائز طور پر کھانے والا بھی نجات ابدی حاصل کر سکتا ہے۔ وہ دین اور دنیا دونوں کو

اہمیت دیتے تھے۔ نورالحسن نقوی اس سلسلے میں ان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''فرض کرو کے ہندوستان میں تمام مسلمانوں کے پاس دولت وحکومت اور منصب نہ رہے۔ سب مفلس اور نان شبینہ کو محتاج ہوں اور دربدر بھیک مانگتے پھریں۔ ان کی اولاد جاہل اور نالائق، چور اور بدمعاش ہو تو اس وقت ان کے دین کا کیا حال ہوگا۔ پیٹ ایک ایسی چیز ہے کہ دین رہے یا جائے۔ خدا ملے یا نہ ملے اس کو بہرحال بھرنا ہے۔ پیٹ بھرنے کے لئے بڑے دینداروں کی نسبت تو یہ خیال ہوسکتا ہے کہ کسی جنگل میں گھاس چھیل رہے ہیں، کسی پہاڑ پر لکڑیاں چن رہے ہیں یا کسی کا گھوڑا مل رہے ہیں لیکن جو ایسے پکے دین دار نہیں ہیں وہ کیا کریں گے۔ معلوم نہیں کہ ان سے جیل خانے اور نوآباد جزائر بھریں گے یا یتیم خانے اور کلیسا رونق پائیں گے بس ایسی حالت میں خیال کرنا چاہئے کہ دین اسلام کی کیا شان ہوگی۔ اگر مسلمانوں کی حالت اتنی خراب ہو جائے کہ واعظین کو جو محض ریاکاری یا

مکاری سے دنیا کماتے پھرتے ہیں کوئی ٹکا دینے والا یا حرام کا

لقمہ تر کھلانے والا نہ رہے۔"

(سرسید اور ہندوستانی مسلمان۔نورالحسن نقوی، ص:۱۵۴)

سرسید احمد کا کہنا تھا کہ دین چھوڑ دینے سے دنیا نہیں جاتی لیکن دنیا چھوڑ دینے سے دین جاتا رہتا ہے۔

دنیا سے بے تعلقی کے نقصانات سے بھی سرسید احمد خاں نے اپنے مضمون کے ذریعہ لوگوں کو آگاہ کیا ہے۔اس وقت کے بیشتر لوگوں کا خیال تھا کہ جب اس دنیا میں رہنا ہی نہیں ہے تو اس کے بارے میں فکر کرنے سے کیا فائدہ۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ ایک طرح کی رہبانیت تھی جو غیر اسلامی ذریعوں سے مسلمانوں کی زندگی میں داخل ہوگئی تھی۔ سرسید احمد لکھتے ہیں کہ ہمارے دین میں کچھ تنگی نہیں ہے جس سے خدا اور رسول نے منع فرمایا ہے اس سے ہم کو پرہیز کرنا چاہئے اور جس چیز سے ہم کو منع نہیں کیا وہ ہمارے لیے حلال اور خدا کی نعمت ہے۔ خدا نے یہ ساری نعمتیں ہمارے لیے بنائی ہیں اور انہیں حاصل کرنے کا ہمارا حق ہے۔ ہاں اگر کوئی ان نعمتوں کے سبب مغرور ہوتا ہے اور خود کو بھول جاتا ہے تو وہ ہمارے لیے ٹھیک نہیں ہے۔

گویا سرسید نے ترک دنیا کے نظریئے کو رد کیا اور اقبالؔ کی طرح قوم کو بے عملی سے نجات دلائی۔

دنیا سے بے تعلقی کی طرح عبادت کے مفہوم سے سرسید احمد خاں نے لوگوں کو آگاہ کردیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ مسلمانوں میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ عبادت کے تعلق سے لوگوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اللہ کی عبادت میں جسم کو جتنی تکلیف پہنچائی جائے گی اتنا ہی ثواب ہوگا۔ چنانچہ بہت سے لوگوں نے بارہ مہینے روزہ رکھنے اور ساری ساری رات کھڑے ہوکر عبادت اور وظائف میں مشغول رہنے کو ہی اصل عبادت سمجھ لیا تھا۔ سرسید احمد نے اس کی مخالفت کی اور خدمت خلق کو سب سے بڑی نیکی قرار دیا۔ عبادت کے لئے گوشہ نشینی کو وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ خدا اور رسول کے احکام کی تعمیل اور بنی نوع انسان کی بھلائی کے کام ان کے نزدیک اہم تھے اس لئے انہوں نے لوگوں کو عبادت کا صحیح مفہوم سمجھانے کی کوشش کی۔

اس طرح موضوع اور مواد کے لحاظ سے سرسید احمد کے مضامین بہت اہم ہیں۔ انہوں نے اپنے مضامین کے ذریعہ قوم کی اصلاح کرنے، قوم کا وقار بلند کرنے اور اپنی قوم کو اوپر اٹھانے کے لئے اپنے مضامین کے ذریعہ جو کارہائے نمایاں انجام دیا ہے اسے کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔

☆☆☆

باب چہارم

مضامین سرسید۔ زبان اور اسلوب

Essays of Sir Syed - Langauge & Style

مضامین سرسید۔ زبان اور اسلوب

اسلوب افکار وخیالات کی ترسیل وابلاغ کا ایک دلکش اور دلنشیں پیرایہ ہے۔ مختف نقادوں نے اپنے اپنے طور پر اس کی الگ الگ تعریف کی ہے اور اس کی حدیں متعین کرنے کی کوششیں کی ہیں لیکن ابھی تک اس کی کوئی جامع تعریف طے نہیں ہوسکی ہے جسے قطعی اور آخری قرار دیا جاسکے۔ کسی نے اسلوب کو مصنف کی جلد قرار دیا ہے تو کسی نے اسے مصنف کا جامہ کہا ہے، کسی نے اسے خیال کا سایہ قرار دیا ہے تو کسی نے اسے مصنف کے دل کی ترنگ۔ تمام نقادوں اور ادیبوں میں اختلاف رائے ہے۔

انگریزی زبان کے ایک ناقد نے شاید اس لیے کہا ہے کہ اسلوب کی تعریف کرنا انگشتانے سے آٹے کی بوری گزارنے کی کوشش کرنا ہے۔ لفظ اسلوب کے بارے میں ڈاکٹر مشتاق احمد فرماتے ہیں:

"انگریزی میں اسلوب کے لئے اسٹائل کا لفظ مستعمل ہے جو لاطینی زبان کے لفظ اسٹائکس سے ماخوذ ہے اور جس کا مطلب

لوہے کا قلم ہوتا ہے۔ عہد قدیم میں روم میں لوہے کے قلم سے موم چڑھی پٹیوں پر لکھا جاتا تھا اور اس آلے کو اسٹیلس یا اسٹائکس کہا جاتا تھا۔ اس رعایت سے ادب کے ضمن میں اسٹائل کا لفظ لکھنے کے فن سے وابستہ ہوگیا۔ یہ لفظ اپنی وسعت کے لحاظ سے اس قدر مقبول ہوا کہ ادب کے علاوہ بول چال میں بھی اس نے رواج پالیا۔ مثلاً گفتگو کا اسٹائل، رقص وسرود کا اسٹائل رفتار وگفتار کا اسٹائل وغیرہ۔

موجودہ فارسی زبان میں اسلوب کے لئے سبک کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جو عربی سے ماخوذ ہے اور جس کے لغوی معنی دھات کو پگھلانے اور سانچے میں ڈھالنے کے ہیں۔ اس لفظ کی معنوی خصوصیات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ دھات کو پگھلا کر حشو وزائد سے پاک کرنا اور اسے کوئی خوشنما شکل دے دینا ایک ایسا عمل ہے جو اچھے اسٹائل میں بھی پایا جاتا ہے۔ سنسکرت میں اسلوب کے لئے रिति کا لفظ رائج رہا ہے جو

ریڑ رीढ़ سے بنا ہے اور جس کا مطلب متحرک ہونا یا چلنا ہے،

پرانے سنسکرت عالموں نے اس لفظ کا استعمال زبان کی تراش و

خراش اور تہذیب و سلیقہ کے لئے کیا ہے۔ ہندی میں ابتداء

میں ہی لفظ مستعمل تھا لیکن بعد میں اس کی جگہ پر शैली کا لفظ

لکھا جانے لگا۔"

(سر سید کی نثری خدمات، ڈاکٹر مشتاق احمد، ص:111)

اسلوب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ادب چونکہ ایک زندہ فن ہے اس لیے اس میں انفرادیت ہوتی ہے، تنوع ہوتا ہے، مصنف کے جذبات و خیالات کی ترجمانی کا یہ ایک ایسا ذریعہ ہے جسے پڑھ کر قاری سمجھ لیتا ہے کہ یہ کس مصنف کی تحریر ہے۔ بے شک اسلوب شخصیت کا اشاریہ ہے۔ اسلوب کے ذریعہ مصنف کی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس بات پر کم و بیش سبھی نقاد اور ادیب متفق ہیں۔

نثری اسلوب کی کئی شکلیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ اگر اسلوب کو شخصیت کا غماز مان لیا جائے تو اس کی تقسیم شخصیت کے پیچ و خم اور نشیب و فراز کو ذہن میں رکھ کر کرنی ہوگی۔ انتخاب الفاظ اور فقرہ تراشی کے نقطۂ نظر سے بھی اس کی تقسیم کی جا سکتی ہے۔ موضوع

کے افادی پہلوؤں کو سامنے رکھ کر بھی اسے دیکھا جاسکتا ہے۔

اس طرح الفاظ اور فقرہ تراشی کے لحاظ سے، قدیم وجدید کے لحاظ سے اور صنعتوں کے لحاظ سے بھی اسلوب کی تقسیم کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر مشتاق احمد کا خیال نقل کرتی ہوں:

> ''انتخاب الفاظ اور فقرہ تراشی کے نقطۂ نظر سے بھی اس کی تقسیم کی جاسکتی ہے۔ جیسے سلیس اسلوب اور دقیق اسلوب، قدیم وجدید کے معیار پر پرکھا جائے تو اسلوب کی دو تقسیم سامنے آتی ہے۔ ایک قدیم اسلوب اور دوسرا جدید اسلوب، پھر صنعتوں کے لحاظ سے بھی دو طرح کے اسلوب ہوسکتے ہیں۔ مرصع اسلوب اور رنگین اسلوب۔ عمومی نکتہ نگاہ سے اسالیب نظر کو نو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (۱) بیانیہ اسلوب (۲) تجزیاتی اسلوب (۳) مرقع جاتی یا محاکاتی اسلوب (۴) توضیحی اسلوب (۵) خطیبانہ اسلوب (۶) مکالماتی اسلوب (۷) طنزیاتی اسلوب (۸) جذباتی اسلوب (۹) شاعرانہ اسلوب''۔

(سر سید کی نثری خدمات، ڈاکٹر مشتاق احمد، ص:۱۱۳)

بیانیہ اسلوب وہ ہے جس میں نثر نگار کسی واقعہ کو پوری سچائی کے ساتھ پیش کردیتا ہے اس میں سلاست، شگفتگی اور روانی کا خیال رکھا جاتا ہے۔ قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھتے ہوئے موضوع کا حق ادا کیا جاتا ہے۔

تجزیاتی اسلوب مصنف کی علمی وادبی صلاحیت اور فنی وفکری پختگی کو ظاہر کرتا ہے کیونکہ اس میں اپنے فکر انگیز اور عالمانہ موضوعات پیش کئے جاتے ہیں، جس میں تنقید و تحلیل، تجزیہ اور منطقی استدلال کی ضرورت ہوتی ہے۔ تجزیاتی اسلوب میں رنگین اور پر تکلف عبارت کا گزر نہیں ہوتا۔

مرقع جاتی یا محاکاتی اسلوب میں مصنف اپنی بیانیہ صلاحیت کی بدولت تشبیہ و استعارہ کے ذریعہ ایسی تصویر کھینچتا ہے کہ یہ پیکر تراشی بن جاتی ہے۔ افسانے، ناول، ڈرامے اور انشائیے میں تخیل کے ذریعہ مصنف جب اپنی سحر کاری دکھاتا ہے تو محاکاتی اسلوب پیدا ہوجاتا ہے۔ اس کے لئے مصنف کو زبان و بیان پر پوری قدرت ہونی چاہئے۔

ادب کے علاوہ دوسرے موضوعات کو ضابطۂ تحریر میں لانے کے لیے توضیحی

اسلوب کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ تاریخ، جغرافیہ، سماجیات، معاشیات اور دیگر علوم وفنون کی متوازن اور اصولی وضاحت سے مصنف قاری کے تاثرات کو موضوع پر مرتکز رکھنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

خطیبانہ اسلوب میں قلم کار مختلف موضوعات پر اس طرح روشنی ڈالتا ہے جیسے وہ اپنے سامنے بیٹھے سامعین سے خطاب کر رہا ہو اور سامعین کے سوالوں کا جواب دے رہا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر مشتاق احمد نے بہت درست فرمایا ہے:

> ''خطیبانہ اسلوب میں اسلوب کار مختلف موضوعات پر اس طرح روشنی ڈالتا ہے گویا وہ اپنے سامنے بیٹھے بے شمار سامعین سے مخاطب ہے۔ اسے سمجھا رہا ہے، سوالات کر رہا ہے اور ان سوالات کا جواب دلائل و براہین سے دے رہا ہے۔ دوسروں کے اصول و نظریات کی تردید کر رہا ہے اور اپنے اصول و نظریات کو منطبق کر رہا ہے۔ ایسے اسلوب کے لئے الفاظ پر عالمانہ عبور کے ساتھ ساتھ زور بیان اور روانی بھی ضروری ہے۔ اس میں مصنف کی شخصی انفرادیت نکھر کر سامنے آتی ہے۔

اگر اس کی انا بالیدہ اور توانا ہے تو وہ بہت جلد قاری کے ذہن پر

چھا جاتا ہے۔ خطیبانہ اسلوب میں انداز تخاطب بھی خصوصی

اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔''

(سرسید کی نثری خدمات، ڈاکٹر مشتاق احمد، ص: ۱۱۴،۱۱۵)

مکالماتی اسلوب کے تحت ناول، افسانہ اور ڈراما کے مکالموں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ایسے اسلوب میں اچھے، برمحل اور بامعنی مکالمے تخلیقی نثر کی فنی عظمت کے ضامن ہوتے ہیں۔

طنزیہ ومزاحیہ اسلوب میں روانی اور بہاؤ کے ساتھ ساتھ بلا کی تاثیر ہوتی ہے۔ جس اسلوب میں طنز ومزاح کی شگفتگی کے ساتھ ساتھ تیکھاپن اور کڑواہٹ ہو اسے طنزیہ ومزاحیہ اسلوب کہا جاتا ہے۔

جذباتی اسلوب میں خیال کی شوزش اس قدر تیز ہوتی ہے کہ بیان خیال پر غالب آجاتا ہے اور اسلوب الفاظ کے سحر میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ تخلیقی اور رومانی نثر میں اس اسلوب کی کارفرمائی دیکھی جاسکتی ہے۔

شاعرانہ اسلوب شوخی ورنگینی زیادہ ہوتی ہے۔ اس اسلوب میں بات زیادہ تر

اشارے وکنائے میں کی جاتی ہے۔ تشبیہات واستعارات کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔

سرسید سے قبل اردو نثر میں دو طرح کے اسلوب تھے۔

(۱) فارسی کے تتبع میں پر تکلف انداز بیان

(۲) فورٹ ولیم کالج کے اردو مصنفوں اور ترجمہ نگاروں کا سادہ اور سلیس طرز

اردو میں پر تکلف انداز بیان دکنی نثر میں بھی ہے۔ اگر لسانی اعتبار سے دیکھا جائے تو دکنی نثر کی کچھ الگ خصوصیات ہیں۔ مقامیت اور لہجے کا فرق بھی ان میں سے ایک بڑی خوبی کہی جاسکتی ہے۔ اس کے باوجود دکنی دور کی بہترین کتاب ملا وجہی کی ''سب رس'' ہے۔ اسلوب بیان کے اعتبار سے یہ کتاب فارسی اسالیب کے کامل تتبع کا پتہ دیتی ہے۔ دکنی نثر کے بعد فورٹ ولیم کالج تک جتنی نثری کوششیں ہمارے سامنے آئیں ان میں عام طور پر پر تکلف انداز ہی غالب ہے۔ تحسین کی ''نوطرز مرصع'' اسی قدیم طرز میں ہے لیکن اسے اس طرز کا بہترین شاہکار کہا جاتا ہے۔

اردو نثر کے پر تکلف انداز کی خاص باتوں میں سے چند یہ ہیں:

(۱) مقفیٰ فقرے

(۲) صنائع بدائع کا استعمال

(۳) موضوع کا خیال بیان اور شاعرانہ انداز

(۴) خیالی موضوع کا غلبہ

اس قسم کی انشائیہ ادبی نثر کے تین بڑے میدان صفات نویسی، تقریظ نویسی اور مکتوب نویسی۔ اس وقت تاریخ اور سوانح لکھنے کا طریقہ بھی عموماً ایسا ہی ہوتا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے مصنفوں اور ترجمہ نگاروں نے اس قدیم انداز کو ترک کر کے اردو نثر کو تکلفات سے آزاد کیا۔ سادہ اور سلیس عبارتوں کا رواج قائم کیا۔ فورٹ ولیم کالج میں زیادہ تر کام ترجمہ نگاری کے تعلق سے ہوا اس لیے ان ترجمہ نگاروں کے یہاں زندگی کے مسائل، ذات اور ماحول کی ترجمانی کیسے ہو پاتی۔ ان لوگوں نے قدیم موضوعات کو نئے طرز بیان میں پیش کر دیا۔ اس طرح اسلوب میں جدید رجحانات کے لیے راستہ صاف کر دیا۔

مرزا غالب نے جو سرسید کے معاصر تھے، اردو نثر کو خالص شخصی تجربات کا ذریعہ بنایا۔ لیکن ان کی نثر میں زمانے کے تجربات کا عکس صرف اس حد تک ہے جس حد تک وہ اپنے آپ کو سمجھتے تھے۔

سرسید کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو نثر کو اپنی زندگی ہی کا نہیں بلکہ اس وسیع معاشرہ کا ترجمان بنایا۔ اس لیے انہیں نئی اردو نثر کا موجد بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے

خود ہی ایک جگہ لکھا ہے:

''جہاں تک ہم سے ہوسکا ہم نے اردو زبان کے علم وادب کی ترقی میں اپنے ناچیز پرچوں (تہذیب الاخلاق) کے ذریعہ کوشش کی۔ مضمون کی ادا کا ایک صاف اور سیدھا طریقہ اختیار کیا۔ جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی۔ الفاظ کی درستی اور بول چال کی صفائی پر کوشش کی۔ رنگینی عبارت سے (جو تشبیہات واستعارات خیال سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر کچھ اثر نہیں ہوتا) پرہیز کیا۔ تک بندی سے جو اس زمانے میں مقفیٰ عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اٹھایا۔ جہاں تک ہوسکا سادگی عبارت پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی کہ جو لطف ہو مضمون کے ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو رہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل ہی میں بیٹھے۔''

(سرسید اور ان کے نامور رفقا، سید عبداللہ، ص:٦٠)

سرسید احمد کی اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ:

(۱) تحریر سادہ ہونی چاہئے

(۲) لطف مضمون میں ہو نہ کہ ادا میں

(۳) جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل پر بھی اثر کرے یعنی وہی مضامین ادا کئے جائیں جن میں سچائی ہو۔

سرسید کا عظیم الشان مقصد تھا۔ اس مقصد میں سیاسی اور تعلیمی مشن کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ ان دونوں اثرات کے تحت ان کی عام تحریروں میں وہ رنگ پیدا ہو گیا جسے سرسید احمد کا رنگ کہا جاتا ہے۔ سید عبداللہ کے مطابق:

''ان کے خیال میں ادب و انشاء مقصد محض تفریح یا محض آرائش بیان نہیں۔ اگر ادب میں صرف تفریح اور آرائش کا نام ہوتا تو وہ شاید ادیب بننا اور کہلانا بھی پسند نہ کرتے۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے اپنی تحریروں میں انشاء کو بڑی اہمیت دی مگر انہوں نے انشاء کو محض انشاء کے لئے اہمیت نہیں دی بلکہ معانی و مطالب کے لئے۔ ان کے نزدیک مضمون اور دل سے نکلا ہوا مضمون طرز

ادا پر مقدم ہے کیونکہ مضمون کے بغیر طرز ادا کا خود بخود فیصلہ ہو جاتا ہے۔ گویا دوسرے الفاظ میں مضمون اپنے ادا کے لئے خود راستہ پیدا کر لیتا ہے۔''

(سر سید اور ان کے نامور رفقا، سید عبداللہ، ص:٦١)

یہ سچ ہے کہ سر سید احمد خاں کی طرز تحریر نے اردو نثر پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ مولانا حالی نے انہیں مذہبی اور مجلسی دونوں طرح کا رفارمر قرار دیا ہے۔ وہ ایک خاص سیاسی نظریے کے علمبردار تھے جس کی وجہ سے ان کی تحریروں میں جوش اور جذبہ کی کارفرمائی ہر جگہ نمایاں ہے۔ ان کی مضمون نگاری میں کھلی تلقین پائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے مضامین میں مسرت اور دلچسپی کا وصف کم ہو گیا ہے۔ سید عبداللہ اس سلسلے میں اس طرح رقم طراز ہوئے ہیں:

''سر سید کے مقالات کی زبان عام فہم ضرور ہے۔ ان کا انداز بیان بھی گفتگو کا انداز بیان ہے مگر سنجیدگی اور متانت نے شگفتگی پیدا نہیں ہونے دی۔ البتہ ایسے مقالات جن میں ترغیبی عنصر کی کمی ہے یا جہاں جوش انگیزی مقصود نہیں ان میں انہوں نے

مضمون نویسی کا اچھا معیار قائم کیا ہے مثلاً مضمون تعصب ، تکمیل ، گزرا ہوا زمانہ وغیرہ ہیں یا رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات یا تہذیب یا سولیزیشن ۔ یا بحث و تکرار ۔ مگر جہاں جوش و خروش کی کیفیت ہے ، وہاں ان کے مضامین (خصوصاً لمبے ہو جائیں تو) توازن کھو بیٹھتے ہیں اور ان کے عام مضمون اعلی اور بہترین مضامین کی صنف میں نہیں رکھے جاسکتے ۔ البتہ اعلیٰ مقالات کی حیثیت سے بعض اوقات وہ لائق تحسین ہو جاتے ہیں ۔"

(سر سید اور ان کے نامور رفقا، سید عبداللہ، ص:٦٦)

سر سید احمد کے مضامین کے مطالعہ کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی موضوع اور ہیئت میں آہنگی ہے ۔ انہوں نے موضوع اور خیال کی مناسبت سے اسلوب بیان اختیار کیا ہے ۔ حالی کے مطابق:

"سر سید کے یہاں ہر مقام کے مقتضا کے موافق ان کی تحریک کا رنگ خود بخود بدل جاتا ہے اگر ان کے علمی و تاریخی مضامین

میں دریا کے بہاؤ جیسی روانی ہے تو مذہبی اور پولیٹیکل تحریروں میں چڑھاؤ کی تیرانی کا ساز ور اعتراضات کے جواب میں متانت اور سنجیدگی ہے اور بے دلیل دعووں کے مقابلے میں ظرافت، جوش طبعی نصیحتیں، نشتر سے زیادہ پر لطف ہے۔ وہی قلم جو اخلاقی کے بیان میں ایک ناصح مشفق کے ہاتھ میں نظر آتا ہے۔ وہ عدالت کے فیصلوں میں ایک کہنہ مشق جج کے ہاتھ میں دکھائی دیتا ہے۔ اور سالانہ رپورٹوں اور جلسوں کی روئدادوں میں ایک تجربہ کار سکریٹری کے ہاتھ میں معلوم ہوتا ہے۔''

(تصانیف احمدیہ۔ جلد اول، حصہ اول، ص:۲)

سرسید کی تحریر میں سادگی وسلاست ہے۔ وہ سلیس رواں اور برجستہ جملے اور فقرے استعمال کرتے ہیں ان کے یہاں پرتکلف اور رنگین عبارتوں کا گزر نہیں۔ وہ پیچیدگیاں جو قدما کی نازک خیالی میں ملتا ہے۔ کہیں کہیں سرسید کے مضامین میں سادگی و بے تکلفی کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص طرح کی حلاوت بھی محسوس ہوتی ہے جو ان کی اعلیٰ انشا پردازی کا زندہ ثبوت ہے مثلاً ''امید کی خوشی'' کا یہ اقتباس:

''اے آسمان پر بھورے بادلوں میں بجلی کی طرح چمکنے والی دھنک، اے آسمان کے تارے تمہاری خوشنما چمک، اے بلند پہاڑوں کی آسمان سے باتیں کرنے والی دھندلی چوٹیو، اے پہاڑ کے عالی شان درختو، اے اونچے اونچے ٹیلوں کے دل کش بیل بوٹو! تم بہ نسبت ہمارے پاس کے درختوں اور سر سبز کھیتوں اور لہراتی ہوئی نہروں کے کیوں زیادہ خوش نما معلوم ہوتے ہو۔ اس لئے کہ ہم سے بہت دور ہو۔ اس دوری ہی نے تم کو خوبصورتی بخشی ہے۔ اس دوری ہی سے تمہارا نیلا رنگ ہماری آنکھ کو بھایا ہے۔ تو ہماری زندگی میں بھی جو چیز بہت دور ہے وہی ہم کو زیادہ خوش کرنے والی ہے۔''

(امید کی خوشی۔ مشمولہ مضامین سر سید، ص:۸۸)

سر سید احمد کے یہاں سادگی کے ساتھ ساتھ زور بیان کی شادابی و شگفتگی بھی ہے۔ دراصل انہوں نے اپنے دل کی بات کو دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ لہجے کے خلوص اور ان کی دردمندی نے ان کی عبارتوں میں سوز و گداز کی کیفیت پیدا کر دی ہے اور

استدلال انداز نے ان کے زور بیان کو اور بھی پر شکوہ بنا دیا ہے۔ سرسید احمد کے بعض مضامین میں محاکاتی وصف اتنا پر اثر ہے کہ بعض اوقات وہ الفاظ اور جملوں کے ذریعہ کسی شئے کی ایسی سچی تصویر کھینچ دیتے ہیں کہ اس کی تصویر ہماری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگتی ہے۔ ایسے موقع پر ان کے مضامین میں افسانوں جیسا لطف پیدا ہو جاتا ہے اور قارئین اس افسانوی لطف میں ڈوب جاتا ہے:

''تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ اس کے کانوں میں میٹھی میٹھی باتوں کی آواز آنے لگی۔ اس کی پیاری ماں اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اس کو گلے لگا کر اس کی پپی لی اس کا باپ اس کو دکھائی دیا۔ چھوٹے چھوٹے بھائی بہن اس کے گرد آ کھڑے ہوئے۔ ماں نے کہا کہ بیٹا کیوں برس کے برس دن روتا ہے، کیونکہ تو بے قرار ہے، کس لئے تیری ہچکی بندھ گئی ہے۔ اٹھ منہ ہاتھ دھو، کپڑے پہن، نوروز کی خوشی منا، تیرے بھائی بہن تیرے منتظر کھڑے ہیں۔ تب وہ لڑکا جاگا اور سمجھا کہ میں نے خواب دیکھا اور خواب میں بڈھا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا سارا

خواب اپنی ماں سے کہا۔ اس نے سن کر اس کو جواب دیا کہ بیٹا

بس تو ایسا مت کر جیسا اس پشیمان بڈھے نے کیا بلکہ ایسا کہ

جیسا تیری دلہن نے تجھ سے کہا۔''

(گزرا ہوا زمانہ۔ مشمولہ مضامین سرسید، ص:۸۴)

شاعری کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی تشبیہات واستعارات سے تحریر میں دلکشی اور رعنائی پیدا کی جاتی ہے، ان سے تحریر کی تزئین وآرائش کا کام لیا جاتا ہے۔ سرسید احمد نے بھی اپنے کچھ مضامین میں تشبیہات واستعارات کی مدد سے حسن پیدا کیا ہے۔

سرسید کی تحریروں میں کہیں کہیں ڈرامائی شان بھی ہے۔ ڈرامائی شان عام طور پر ان کی تمثیلوں میں جلوہ گر ہے۔ ''امید کی خوشی''، ''آدم کی سرگزشت''، ''تہذیب''، ''بحث تکرار'' اور ''گزرا ہوا زمانہ'' جیسے اہم مضامین میں ان کے اس انداز کو دیکھا جاسکتا ہے:

''ہندوستان کے مسلمانوں کو اسی خیال نے غارت اور برباد کیا

ہے اور یہی خیال ہے جو ہندوستان کی رعایا کو عموماً اور مسلمانوں

کو خصوصاً گورنمنٹ سے ناراض رکھتا ہے۔ پس جب تک یہ

خیال نہ جاوے گا اور یہ خیال نہ آوے گا کہ ہم خود سوچیں کہ ہم

کو اپنے لئے کیا کرنا چاہئے اس وقت تک ہندوستان کے

مسلمانوں میں نہ دولت ہوگی نہ حشمت۔ نہ عزت ہوگی نہ

منزلت۔ اور نہ تہذیب ہوگی اور نہ شائستگی ۔مگر دوسرا جملہ جو

مذہب سے متعلق ہے وہ کسی قدر صحیح ہے اور کسی قدر غلط۔ یعنی

مذہب بلاشبہ تہذیب کا بڑا مانع ہے۔"

(انتخاب مضامین سرسید۔ مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور، ص:۱۰۲)

سرسید کے مضامین اور دوسری تحریروں میں جابجا ضرب المثل اور روزمرہ محاورے بھی ملتے ہیں جن سے ان کی اردو نثر کی بے ساختگی اور زبان وادا کی شگفتگی نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ اس اقتباس میں ان کے بے تکلف انداز اور محاورہ کے حسن کو دیکھا جاسکتا ہے:

"اے صاحب یہ کون کہتا ہے کہ مہذب قوموں میں کوئی عیب

نہیں ہوتا مگر یہ تو دیکھو کہ ان میں ان عیبوں کے ساتھ بہت سی

بھلائیاں اور خوبیاں بھی ہیں ہم ان کے عیبوں کو تکیں جبکہ خود ہم

میں عیب ہی عیب بھرے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ چھاج بولے تو

بولے جس میں نو سو بہتر چھید۔''

(بحوالہ سرسید کی نثری خدمات۔ڈاکٹر مشتاق احمد،ص:۱۲۶)

سرسید احمد نے سائنٹیفک اور تجزیاتی اسلوب کی بنیاد ڈالی ہے۔انہوں نے اپنی بات دوٹوک اور واضح لفظوں میں کہنے کی روایت قائم کی۔ان کے مضامین میں حسن بیان اور زبان کی سلاست وفصاحت کے اعتبار سے اردو ادب میں بے حد اہم ہیں۔انہوں نے اپنی عبارت میں تشبیہ واستعارہ اور تمثیل وتلمیح سے کام لیا ہے جس کی وجہ سے ان کی نثر میں ایک ایسا حسن پیدا ہو گیا ہے جو اس سے پہلے نہ تھا۔حامد حسن قادری سرسید کی اسلوب نگارش کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

''سرسید کی تحریر میں زبان ومحاورہ کی لطافت، بیان کی سادگی و صفائی، استعارہ وتشبیہ اور دیگر صنائع کا اعتدال، بے ساختگی، زبان کا جوش، طرز ادا کی روانی، استدلال کا زور، محاکات و منظر کشی، حسب موقع متانت وظرافت اس قدر کثرت صحت اور موزونیت کے ساتھ ہے کہ ان کے پہلے کہیں نہ تھی۔''

(داستان تاریخ اردو، حامد حسن قادری،ص:۳۱۵)

اردو نثر سرسید سے پہلے بہت سقیم حالت میں تھی۔ انہوں نے گرچہ قومی وملکی فلاح اور اعلیٰ مغربی علوم کے حصول کے لیے تحریک چلائی تھی مگر اس تحریک کا بنیادی جز ان کی نثری خدمات ثابت ہوئی۔ دراصل انہوں نے اصلاحی پروگرام کے تمام مہمات اردو نثر کے ذریعہ سر کئے تھے اس لیے اصلاحی پروگرام کی کامیابی کے ساتھ ساتھ اردو نثر کی بھی خدمت ہوتی رہی۔ ان کی نثر سے قبل اردو زبان کے مزاج پر زیادہ تر تفریحی عوامل حاوی تھے۔ سرسید نے قدیم فکری رجحان کو تبدیلی کر کے اس سے زندگی کی رہنمائی کا کام لیا اور اسے وسیع معاشرے کا ترجمان بنادیا۔ انہوں نے حالات حاضرہ کے مسائل سے اردو ادب کا تعلق قائم کیا اور یہ عمل قدم ادب برائے زندگی کی پکار بن گیا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''سرسید تحریک میں گرچہ مرکزی حیثیت قومی وملکی فلاح اور اعلیٰ مغربی علوم کے حصول کی تھی۔ مگر اس تحریک کا بنیادی جز ان کی نثری خدمات کو بھی قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ انہوں نے اپنے اصلاحی پروگرام کے تمام مہمات اردو نثر کے ذریعہ ہی سر کئے تھے اور روشن ونتیجہ خیز امکان پیدا کرنے اور ذہنی انقلاب لانے

کے لئے ادب کو ترقی دی تھی۔ ان سے قبل اردو زبان کے مزاج پر تفریحی عناصر حاوی تھے۔ سرسید نے نثر کے تفریحی مزاج اور قدیم فکری رجحان کو تبدیل کر کے اس سے زندگی کی رہنمائی کا کام لیا اور اسے سماجی شعور کی برکتوں کو عطا کر کے وسیع معاشرے کا ترجمان بنا دیا۔ انہوں نے مسائل حاضرہ سے ادب کا تعلق قائم کیا تو اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ اردو نثر مختلف مقاصد کے حصول کا آلہ کار بن سکتی ہے۔ اس طرح سرسید کا یہ عملی اقدام ایک طرف ادب برائے زندگی کی پکار بن گیا تو دوسری طرف اس سے ارفع واعلیٰ زبان کی تعمیر ہوئی۔‘‘

(سرسید کی نثری خدمات، ڈاکٹر مشتاق احمد، ص:۱۳۱)

پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ سرسید سے پہلے اردو کا سرمایہ بہت کم تھا جو تھا وہ بھی کئی طرح کے عیبوں سے بھرا ہوا تھا۔ فضول عبارت آرائی، تصنع اور بناوٹ اردو نثر میں بھرا ہوا تھا۔ اس وجہ سے اردو نثر کامیاب وسیلہ اظہار میں مانع تھے۔ اس وقت علم وانشا کی خوبی لفظوں کے جمع کرنے اور ہم وزن کلموں تک ملانے، دور از کار خیالات بیان کرنے اور

مبالغہ آمیز باتوں کے لکھنے پر منحصر تھا۔ ''تہذیب الاخلاق'' کے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''زمانہ اور زمانے کی طبیعت اور علوم اور علوم کے نتائج سب تبدیل ہوگئے ہیں۔ ہمارے ہاں کی قدیم کتابیں اور ان کا طرز بیان اور ان کے الفاظ مستعملہ ہم کو آزادی اور راستی اور صفائی اور سادہ پن اور بے تکلفی اور بات کی اصلیت تک پہنچنا ذرا بھی تعلیم نہیں کرتے بلکہ برخلاف اس کے دھوکے میں پڑنا اور پیچیدہ بات کہنا اور ہر بات کو نون مرچ لگا دینا اور ہر امر کی نسبت غلط اور خلاف واقع الفاظ شامل کر دینا اور جھوٹی تعریف کرنا سکھاتے ہیں۔''

(بحوالہ سرسید اور ہندوستانی مسلمان۔ نورالحسن نقوی، ص:۱۶۹)

مصنوئی اور پرتکلف زبان سے سرسید احمد بے حد ناراض تھے کیونکہ اس کی وجہ سے زبان کو وسعت دینے اور جدید علوم کو اس میں منتقل کرنے میں خاصی دشواری پیدا ہو رہی تھی۔ مقفیٰ اور مسجع عبارت کی وجہ سے قاری کی توجہ مضمون سے زیادہ قافیہ وزن پر رہتی تھی۔ اس لیے انہوں نے سادہ اور سہل زبان کی وکالت کی۔ انہوں نے اپنی تحریروں کے

ذریعہ اردو زبان کو فروغ دیا اور دوسروں کو اس طرف مائل کیا۔ شاعری میں ذرا سا بھی مبالغہ آرائی انہیں پسند نہیں تھی۔

دوسری زبان کے الفاظ کو اپنی زبان میں داخل کرنے کو سرسید احمد بہت ضروری سمجھتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ اس سے زبان کا دامن وسیع ہوتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ جو لوگ ایسا خیال کرتے ہیں کہ اردو میں انگریزی لفظ ملانا ٹھیک نہیں ہے، ان کی سوچ غلط ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ اردو زبان میں ہمیشہ نئے نئے لفظ ملتے رہیں اور زبان ترقی کرتی رہے۔ غیر زبان کے الفاظ کو اپنا لینا اہل زبان کا کام ہے۔ جب کوئی زبان اپنے آپ کو محدود کر لیتی ہے تو وہ رفتہ رفتہ مردہ ہو جاتی ہے۔

عربی زبان کی ترقی کے راز کو سرسید احمد یہی بتاتے ہیں کہ یہ زبان نئے علوم و فنون کے ساتھ نئے الفاظ شامل کرتی رہی ہے۔ قرآن کریم کی مثال دے کر وہ بتاتے ہیں کہ اس میں دوسری زبانوں کے بے شمار الفاظ شامل ہیں۔ نورالحسن نقوی لکھتے ہیں:

> ''دوسری زبان کے لفظوں کو اپنی زبان میں استعمال کرنے کے دیگر اسباب پر بھی وہ روشنی ڈالتے ہیں۔ عبارت کا لطف بڑھانے کے لئے بھی ایسا کیا جاتا ہے، کبھی دوسری زبان سے

نئے لفظوں کا اضافہ کر کے اپنی زبان کو وسعت دینا مقصود ہوتا

ہے، کبھی مطلب کو واضح کرنے اور سامعین کو متوجہ کرنے کے

لئے دوسری زبان کے لفظ بولے جاتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا

ہے کہ دوسری زبان کے اس لفظ کا مترادف اپنی زبان میں ہاتھ

نہیں آتا مثلاً ''جنٹلمین'' کی جگہ ''شریفوں'' استعمال کیا جائے

تو مطلب ادا نہیں ہوتا۔''

(سرسید اور ہندوستانی مسلمان، نورالحسن نقوی، ص:۱۷۵)

سرسید کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اردو ادب کو جو اس وقت تک بیکاروں کا مشغلہ تھا، قومی ترقیوں اور قومی امنگوں کا ذریعہ بنایا۔ اسے آسمانوں پر پرواز کرنے کے بجائے دھرتی پر قدم رکھنا سکھایا۔

سرسید احمد کے بارے میں بیشتر لوگوں کا خیال ہے کہ وہ جدید اردو نثر کے معمار اول ہیں لیکن کچھ لوگ ان کی اردو نثر کو بے مزہ، کرخت اور ناخوشگوار بھی قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو ادب پر شاعری خاص طور سے غزل کا غلبہ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے اصناف ادب میں بھی ہم غزل کی خصوصیات تلاش کرتے ہیں۔ سرسید احمد نے

عام فہم اور سادہ نثر کو ضروری گردانا اور عملی شکل میں بھی پیش کیا اس لیے کچھ لوگوں کو ابتدا میں ان کی اردو نثر کمزور نظر آئی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں کے اندر تبدیلی آئی اور وہ لوگ بھی ان کی نثر کو سراہنے لگے۔

دراصل اس وقت خیال پر کم اور لفظوں پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ سرسید کے ابتدائی نثر مثلاً ''آثار الصنادید'' کی نثر کے بارے میں دو متضاد خیالات ملتے ہیں کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس پوری کتاب کو ان کے ایک دوست امام بخش صہبائی نے لکھی ہے اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ سرسید نے نصف اور ان کے دوست صہبائی نے نصف حصہ لکھ کر کتاب مکمل کی ہے۔ دونوں صورتوں میں بات واضح ہے۔ نورالحسن نقوی لکھتے ہیں:

''اس وقت تک سرسید کو اردو نثر کے عیوب کا احساس نہ ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے پہلے وہ اپنے رسالوں کے بعض حصوں میں آسان زبان استعمال کر چکے تھے لیکن اس لیے نہیں کہ وہ اسے اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے ضروری خیال کرتے تھے بلکہ شاید اس لیے کہ وہ مروجہ انداز کی نثر نگاری پر قادر نہ تھے لیکن جلد ہی یہ خیال ان کے دل میں مستحکم ہو گیا کہ

اس طرز تحریر کے خلاف آواز اٹھانی چاہیئے اور ایک نئے
اسلوب کی داغ بیل ڈالنی چاہیئے ۔ فورٹ ولیم کالج کی
داستانوں نے سہل نگاری کا راستہ پہلے ہی دکھادیا تھا اور خطوط
غالب کے شخصی اسلوب نے سادہ مگر دل نشیں انداز میں ادائے
مطالب کے امکانات روشن کردیے تھے لیکن ابھی تک وہ نثر
وجود میں نہ آئی تھی جس میں ہر قسم کے علمی مضامین ادا کیے
جاسکیں اور جس سے معاشرے کی ترجمانی کا کام لیا جاسکے۔ یہ
کام سرسید کے ہاتھوں انجام پانا تھا۔''

(سرسید اور ہندوستانی مسلمان، نورالحسن نقوی، ص: ۱۹۸)

سرسید نے نثر کو سماجی بہبود کا وسیلہ بنایا۔ وہ صرف مصنف نہ تھے بلکہ مصلح بھی تھے۔ اپنی تحریروں کے ذریعہ وہ لوگوں کے دلوں میں اثر پذیری اور صلاحیت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنی باتوں کو مدلل بنا کر پیش کرتے تھے۔ اس طرح اردو نثر میں استدلال نثر کا آغاز ہوا۔ تعمیری اظہار کو نثری اسلوب کی بنیادی شرط قرار دیا گیا ہے۔ سرسید نے پہلی بار تعمیری اظہار کے لئے ایسے نثری اسلوب کو قائم کیا:

''ہم دریافت کیا چاہتے ہیں کہ سولزیشن کیا چیز ہے اور کن کن چیزوں سے علاقہ رکھتی ہے؟ کیا یہ کوئی بنائی ہوئی چیز ہے یا قدرت نے انسان کی فطرت میں اس کو پیدا کیا ہے؟ اس کے معنی کیا ہیں؟ کیا یہ کوئی اصطلاح ہے جس کو لوگوں نے یا فیلسوفوں نے مقرر کیا ہے؟ یا یہ ایسی چیز ہے کہ اس کا مفہوم اور جن جن چیزوں سے اس کا تعلق ہے قانون قدرت میں پایا جاتا ہے۔ اس امر کے تصفیہ کے لئے انسان کے حالات پر ہم کو نظر کرنی چاہئے اگر تہذیب انسان میں ایک فطرتی چیز ہے تو وہ وحشیوں میں۔ شہریوں میں سب میں اس کا نشان ملے گا گو اس کی صورتیں مختلف دکھائی دیتی ہوں۔ الاّ سب کی جڑ ایک ہی ہوگی۔''

(انتخاب مضامین سرسید۔ مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور، ص:۹٦)

سرسید کے یہاں اسلوب کی جو ہمہ آگہی ملتی ہے وہ بہت کم نثر نگاروں کے یہاں پائی جاتی ہے۔ انہوں نے سیاست، مذہب، فلسفہ، قانون، تاریخ، جغرافیہ اور ادب

جیسے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا۔ضروریات بہت ساری تھیں ۔موضوعات بہت سارے تھے اس لئے طرز تحریک پر یکساں ہونا ممکن نہ تھا۔ جہاں قوم کی غلط رسموں کی برائیوں سے آگاہ کرنا ہے وہاں طنز کا عنصر غالب ہے، کسی کو اپنی بات سے قائل کرنا ہے تو استدلالی انداز نمایاں ہے۔ کسی کو کوئی نکتہ ذہن نشیں کرانا ہے تو وضاحت سے کام لیا ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سرسید کا اسلوب ہزار رنگ ہے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ انہوں نے جتنا زیادہ لکھا ہے اس حساب سے ان کے یہاں طنز وظرافت کم ہے۔ انہوں نے ایڈیشن اور اسٹیل کی پیروی کرتے ہوئے قوم کی اصلاح کرنے کی کوشش کی تھی۔ دونوں ہنسی ہنسی میں اپنا کام آسانی سے کر گئے لیکن سرسید احمد ایسا نہ کر سکے۔ ان کی نثر منطقی اور سنجیدہ ہے۔

پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ سرسید احمد کو اتنی فراغت نہ تھی کہ ذہن کو گدگدانے والی تحریر لکھتے۔ ان کے ذہن میں جذبات کا ہیجان اور خیالات کا طوفان تھا۔ دوستوں اور دشمنوں دونوں کی باتیں بعض اوقات ان کی روح کو تلملا دیتیں ایسے میں ان کے لہجے میں کرختگی کا پیدا ہو جانا حیرت کی بات نہیں ہے۔ پھر بھی ان کے یہاں مزاح کی چاشنی جا بجا موجود ہے:

"امید ہے تم مجھ کو اپنے پاس نہ بیٹھنے دو گے تو اپنی جوتیوں کے

پاس بیٹھنے دوگے۔ اگر اپنے پاس بٹھلا کر نہ دوگے تو کتے کی
طرح دوسری رکابی میں آگے رکھ دوگے ورنہ لوگ تو مجھ کافر کو
روٹی پانی دینا بھی کفر سمجھے لگے ہوں گے۔ ہزار ہزار شکر ہے کہ
میرا خدا ایسا نہ ہوا جس کی کہ لاکھوں روز تقصیریں کرتا ہوں اور
روٹی دیتا ہے اور کیا عجب ہے کہ بقول شخصے قیامت کو بھی اپنی
مہربانی سے اپنے داہنے ہاتھ پاس بٹھالے لیکن اگر وہ بھی
میرے بھائی بندوں یا میرے ہم مذہب مسلمانوں کا سا ہوتا تو
میں کیا کرتا۔ اس وقت تو مولوی مہدی علی صاحب کا بھی سہارا
نہ رہتا۔ واہ واہ کیا میری قسمت ہے۔ میرے خدا نے اچھا خدا
مجھ کو دیا ہے۔"

(بحوالہ سرسید اور ہندوستانی مسلمان۔ نورالحسن نقوی، ص:۲۰۴)

سرسید احمد کی اردو نثر کے معائب کی طرف کئی لوگوں نے اشارہ کیا ہے۔ ان کی نثر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ صناعی و رعنائی سے دور رہے۔ یہ سچ ہے کہ چند مضامین کو چھوڑ کر سرسید کے احمد باقی مضامین میں یہ عنصر موجود نہیں ہے۔ مولانا حالی اور

دوسرے کئی لوگوں نے سرسید احمد کی نثر نگاری کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی نثر ضرورتاً لکھی ہوئی ہے۔اور ضرورتاً آدمی ایسے الفاظ کا استعمال کرتا ہے جو وقت کے حساب سے بے تابانہ نکل جاتے ہیں۔مختلف اوقات میں ضرورتیں بھی مختلف تھیں اس لیے سرسید احمد ایک طرح سے گھبراہٹ کے عالم میں بھی بہت کچھ لکھ گئے۔انہیں اپنی قوم کے ان کے عیوب سے آگاہ کرنا تھا۔نورالحسن نقوی اس سلسلے میں اس طرح گویا ہوئے ہیں:

> ''انہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود جو کچھ لکھا ہے وہ مقدار کے لحاظ سے اتنا زیادہ ہے کہ آج اس پر حیرت ہوتی ہے۔اس لئے ممکن نہ تھا کہ وہ اپنی تحریروں پر نظر ثانی کر سکیں، اس کی نوک و پلک سنوار سکیں۔تراش خراش سے کام لے سکیں یا مرصع کاری کا تصور بھی کر سکیں۔وقت تنگ تھا اور کہنے کو بہت کچھ۔ذہن میں خیالات کا ہجوم تھا جو کسی نہ کسی طرح کاغذ پر بکھر جانا چاہتا تھا۔چنانچہ جو جملہ جس طرح قلم سے نکل گیا بس وہ اسی طرح برقرار رہا۔اکثر ایسا ہوا کہ انہیں اپنی لکھی ہوئی عبارت کو ایک بار پڑھنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ان کی نثر اس

ادبی حسن سے محروم ہے جو خون جگر صرف کرنے یعنی عبارت کو

بار بار سنوارنے اور ایک ایک لفظ کو پرکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔

ان کی نظر مطلب نویسی اور مدعا نگاری پر رہتی ہے اس لیے اکثر

ان کی عبارت میں ناہمواری اور کھردرا پن پیدا ہو جاتا ہے۔''

(سرسید اور ہندوستانی مسلمان، نورالحسن نقوی، ص: ۲۰۰)

سرسید احمد کے یہاں حسن بیان کم ہے لیکن خیال آئینے کی طرح چمکتا ہے اور پڑھنے والے کے دل میں گھر کر لیتا ہے۔ ان کے مضامین میں جذبے کی صداقت تاثیر کی ضامن ہے۔

سرسید احمد کے مضامین میں انگریزی الفاظ کا زیادہ استعمال ہوا ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے بعض معاصرین کے یہاں بھی ایسا ہوا ہے۔ لیکن ایسی بات نہیں ہے کہ انہوں نے لکھنے کے دھن میں انگریزی الفاظ کا استعمال کر گئے ہوں بلکہ یہ ایک شعوری کوشش ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اپنی زبان کے دامن کو وسیع کرنے کے لئے دوسری زندہ زبانوں کے الفاظ کو اس میں شامل کرنا چاہئے اور دوسری زبانوں کے الفاظ کو بلا تامل قبول کر لینا چاہئے۔ ورنہ زبان کمزور ہو جاتی ہے۔

سر سید احمد کے یہاں متروک الفاظ بھی مل جاتے ہیں مثلاً ااویں، جاویں، کھاویں وغیرہ۔ کہیں کہیں انہوں نے اردو قواعد کی پابندی کا بھی خیال نہیں رکھا ہے خاص کر تذکیر و تانیث کا جیسے غل مچائی، چمک آئی اور رسم بنائی وغیرہ۔

یہ ساری باتیں اپنی جگہ درست لیکن ان کا ذہن لطافت کے بجائے عظمت کا دلدادہ تھا۔ مقصد ان کے سر پر بھوت بن کر سوار تھا۔ سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> ''سر سید کا لطافت کے بجائے عظمت اور جسامت کا دل دادہ تھا۔ انہیں قویٰ ہیکل اور جسیم اشیاء سے رغبت تھی۔ اس کا اظہار ان کے تمام اعمال اور کارناموں سے ہوتا ہے۔ اسی کی وجہ سے انہوں نے زندگی میں عظیم الشان مقاصد کو مدنظر رکھا۔ شاہان قدیم کے عظیم الشان آثار کی سرگذشت اور اکبر کی عظیم الشان تاریخ ملک داری (یعنی آئین اکبری کی تصحیح و اشاعت) سے لے کر مدرسۃ العلوم مسلمانان ہند کے قیام تک ان کی زندگی کے سب منصوبے عظیم و جسیم اور پر ہیبت ہی تو ہیں۔ ان کی پیدا کردہ ادب حسین ہو یا نہ ہو مگر ان کے ادب کی جسمانی عظمت

اور جسامت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا ذہن معمولی تراش

خراش اور جزیاتی آراستگی پر ادب پارے کے جسم اور طول و

عرض کو ترجیح دیتا تھا۔''

(سرسید اور ہندوستانی مسلمان۔ نورالحسن نقوی، ص:۲۰)

سرسید احمد کے مضامین میں چند معائب کو چھوڑ کر دیکھا جائے تو ان کے نثری

کارنامے بے حد اہم ہیں۔ ڈاکٹر مشتاق احمد نے اس سلسلے میں کتنا درست فرمایا ہے:

''سرسید کی تحریر کے تمام معائب کے اعتراف کے باوجود اس

حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے نثری کارنامے

اپنے متعلقہ عہد کے لحاظ سے کافی گراں قدر ہیں۔ ان کی

تحریروں میں زبان و محاورہ کی لطافت، بیان کی سادگی و صفائی،

استعارہ و تشبیہ اور دیگر صنائع کا اعتدال بے ساختگی، بیان کا

جوش، طرز ادا کی روانی، استدلال کا زور، محاکات و منظر کشی اور

حسب موقع متانت و جزالت سب کچھ موجود ہے۔''

(سرسید کی نثری خدمات، ڈاکٹر مشتاق احمد، ص:۱۳۰)

اس طرح سرسید احمد کے مضامین کا مطالعہ زبان اور اسلوب کے لحاظ سے کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اردو نثر کو اپنی زندگی ہی کا نہیں بلکہ پورے معاشرہ کا ترجمان بنایا۔ ان کا عظیم الشان مقصد سیاسی اور تعلیمی مشن تھا۔ ان دونوں اثرات نے ان کی تحریروں میں وہ رنگ پیدا کر دیا جسے سرسید احمد کا رنگ کہا جاتا ہے۔ اس رنگ میں سادگی سلاست ہے۔ اس رنگ میں پر تکلف اور رنگین عبارتوں کا گزر نہیں۔

☆☆☆

باب پنجم

مضامین سرسید کا دوسری تحریروں سے موازنہ

Comparision of Essays with other writtings of Sir Syed

مضامین سرسید کا دوسری تحریروں سے موازنہ

سرسید احمد خاں کثیر الجہات مصنف تھے۔ ان کے کارناموں کی لمبی فہرست ہے۔ انہوں نے اردو زبان وادب کو ترقی دے کر اس کے نشو ونما میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ انہوں نے اردو نثر کو اجتماعی مقاصد سے روشناس کیا اور اسے سادہ سلیس اور عام فہم بنا کر عام اجتماعی زندگی کا ترجمان بنایا۔ ان کے دور میں عام طور پر طرز بیان کو اہمیت دی جاتی تھی۔ انہوں نے مضمون کو اولیت دی۔ اس وقت نثر میں تکلف اور تصنع بھرا ہوا تھا، سرسید احمد نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔

سرسید احمد خاں نہایت اثر پذیر شخص تھے۔ وہ جس ماحول میں رہے اس کا اثر قبول کیا۔ ان کے اندر وقت کے ساتھ ساتھ بدل جانے کی بڑی صلاحیت تھی یہی وجہ ہے کہ ان کی تصانیف ارتقا اور تغیر کا عجیب وغریب نقشہ پیش کرتی ہیں۔ ان کی ابتدائی زندگی پر خاندانی روایات کا اثر تھا اس کے بعد انگریزی ملازمت کے دوران نئی فضاؤں سے آگاہ ہوتے رہے۔ اس دور میں وہ پرانی ڈگر سے ہٹ کر یوروپ کے لوگوں کے نقش قدم پر چلنے

کی کوششیں کیں۔ پہلی جنگ آزادی (غدر) کے بعد ان کا ذہن زندگی کے جدید تر مسائل سے دوچار ہوتا رہا۔ سفر انگلستان کے بعد ان پر مغربی خیالات ورجحانات کا جو رنگ چڑھا وہ ساری زندگی ان کے ساتھ رہا۔ سید عبداللہ فرماتے ہیں:

''ان کی زندگی کا ابتدائی دور قدیم خاندانی روایات کے اثر میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد انگریزی ملازمت کے زیر اثر وہ نئی ہواؤں اور نئی فضاؤں سے روشناس ہوتے ہیں۔ اس میں وہ پرانی ڈگر سے ہٹ کر مستشرقین یوروپ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے بعد زمانۂ غدر کے مسائل ومباحث سامنے آتے ہیں اور ان میں ان کا ذہن زندگی کے جدید تر اور عجیب تر مسائل سے دوچار ہوتا ہے۔''

(سرسید اور ان کے نامور رفقا، سید عبداللہ، ص: ۱۴)

مضامین سرسید ان کی دوسری تحریروں سے موازنہ کرنے کے لئے ان کی تصنیفی زندگی کو کئی خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جیسے مذہبی، تاریخی، سیاسی، اور اصلاحی۔

سرسید احمد کی مذہبی فکر میں سب سے زیادہ اہم پہلو مغربی تہذیب اور عیسائی

مذہبی تحریک ہے۔ دراصل وہ مختلف فیہ مذہبی مسائل میں پڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن اس وقت معاشرے میں مذہب کے بغیر کوئی گفتگو مکمل نہ تھی اس لیے انہیں بھی کبھی کبھی اپنے معتقدات کا اظہار کرنا پڑا۔ ابتدا میں انہوں نے اپنے دینی تصورات کو رسائل کے ذریعہ عام کرنے کی کوشش کی اور اس جدید رجحان کی روشنی میں قرآن مجید کی نئی تفسیر پیش کی۔

سر سید احمد خاں نے مذہب سے متعلق تمام تحریروں کو ''تصانیف احمدیہ'' کی نو جلدوں میں یکجا کر دیا ہے اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

''اس میں متعدد مذہبی کتابوں کے لکھنے کا اتفاق ہوا جو ہر ایک وقت کے خیالات کے مطابق ہیں ان سب کا بترتیب جمع کرنا گویا ان تمام زبانوں کے خیالات کو بہ ترتیب سامنے رکھنا ہے جس سے شاید مجھ کو اور آئیندہ آنے والی نسلوں کو فائدہ ہو پس میں اپنی تصنیفات کے اس حصہ میں مذہبی کتابوں اور رسالوں کو ایک جگہ جمع کرتا ہوں۔ گو مجھ کو علمی لیاقت کچھ نہیں اور میرا درجہ ایک جاہل آدمی سے شاید ہی کچھ زیادہ ہو لیکن اللے پن سے سوچنے والی طبیعت تھی۔ جب حیوانی زندگی سے طبیعت نے

دوسری طرف پلٹا کھایا تو اس کی کروٹ بجز مذہبی کروٹ کے

اور کیا ہوسکتی تھی۔ اور وہ پہلو بجز اس پہلو کے جو علم تھا اور جس پر

سب کا یقین تھا اور کیا ہوسکتا تھا۔''

(تمہید تفسیر القرآن، سرسید احمد مشمولہ سرسید اور ان کا عہد مرتبہ ثریا حسین، ص:۵۹)

سرسید احمد نے ۱۸۴۲ء میں ایک مختصر رسالہ ''جلاء القلوب بذاکر المحبوب''
لکھا۔ اس رسالہ میں انہوں نے رسالت مآب سے متعلق ضروری معلومات لوگوں تک
پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے دور میں محفل میلاد کی محفلیں کثرت سے آراستہ کی جاتی
تھیں۔ اس وقت جو مولود نامے موجود تھے انہیں لوگ بڑی عقیدت سے پڑھتے تھے۔
انہوں نے پیغمبر اسلام ''رسول اکرم ﷺ کے مختلف نام، شکل وصورت، وضع قطع اور سیرت
کے ساتھ ساتھ آپ کے صحابہ کا پالتو جانور، نجی ہتھیار، آپ کے معجزے اور آپ کے حجتہ
الوداع کا تذکرہ کیا ہے۔

تحفۂ حسن: ''تحفۂ اثناعشریہ'' مولانا شاہ عبدالعزیز کے رسالہ سے متاثر ہوکر سید احمد خاں
نے اس کے دسویں اور بارہویں باب کا اردو میں ترجمہ ''تحفۂ حسن'' کے نام سے کیا۔ اس
کی تیاری میں انہوں نے اپنے استاد مولانا نورالحسن دہلوی سے مدد لی تھی جس کا اعتراف

انہوں نے خود کیا ہے۔ یہ پہلی بار ۱۸۴۲ء میں چھپا تھا۔

کلمۃ الحق:۔ اس میں پیری مریدی سے بحث کی گئی ہے اور خانقاہی رسم و رواج پر اعتراض کیا گیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ دین حضور ﷺ کی حیات میں ہر اعتبار سے مکمل ہو گیا تھا اس لئے اب اسمیں کسی قسم کا اضافہ غلط ہے۔

سولہ صفحات پر مشتمل اس رسالہ میں سرسید احمد خاں نے سنت کی تائید اور بدعت کی مخالفت کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ خدا کی اطاعت اور رسول کریم کی سنت کی پیروی کے علاوہ نجات کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

سرسید خاں نے امام غزالی کی کتاب کیمائے سعادت کے کچھ حصوں کا ترجمہ ''دیباچہ کیمیائے سعادت'' کے نام سے کیا۔ اس کتاب میں زور دیا گیا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے، اسے اپنی جسمانی اور روحانی تربیت اس طرح کرنی چاہئے کہ اسے رضائے الٰہی اور خوشنودی رب حاصل ہو جائے۔ پہلی بار یہ ۱۸۵۲ء میں شائع ہوا تھا۔

سرسید احمد خاں نے ''رسالہ احکام طعام اہل کتاب'' لکھ کر اپنی رائے لوگوں کے پاس پیش کی کہ قرآن مجید اجازت دیتا ہے کہ اہل کتاب کے یہاں کا ذبیحہ گوشت مسلمان کھا سکتے ہیں۔ دوسری بات انہوں نے یہ کہی ہے کہ انہیں کھانے کی دعوت دینا اور

ان کے کھانے کی دعوت کو قبول کرنا اسلامی نقطۂ نظر سے درست ہے۔

تبیینہ الکلام:۔ اس کتاب میں سرسید احمد خاں نے انجیل کا تحقیقی مطالعہ کیا ہے۔ دوسرے مذاہب کی دینی کتابوں کا بغور مشاہدہ اور تجزیہ کرنا ایک بڑی بات کہی جاسکتی ہے۔ انہوں نے اردو میں تقابلی مطالعہ کی بنیاد ڈالی۔

اس کتاب میں اردو متن کے ساتھ انگریزی ترجمہ بھی شامل ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ انگریزی میں بھی اسلام کی اشاعت کی جائے اور ہندوستانیوں کو دونوں مذاہب کے مشترک اصولوں سے واقف کردیا جائے۔

الخطبات الاحمدیہ:۔ ۵۲۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں بارہ مقالے ہیں۔ اس کتاب کے لکھنے میں جو پریشانیاں اور دشواریاں پیش آئیں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ تقریباً سوا سال تک انگلستان کے اہم کتب خانوں، کتب فروشوں کی دکانوں اور مستشرقین سے استفادہ کیا۔ اپنے دوستوں اور عالموں سے مطلوبہ معلومات فراہم کیں۔ جس کتاب کے لکھنے کا ارادہ انہوں نے کیا تھا اس کے لئے نہ صرف انگریزی اور عربی جاننا ضروری تھا بلکہ یونان، لاطینی، عبرانی اور جرمن وفرانسیسی بھی۔ وہ نہ صرف غلط اعتراضوں کی تردید کرنا چاہتے تھے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کو تقابل سے

اسلام کی طرف راجع کرنا چاہتے تھے۔ اس کتاب کی فہرست اس طرح ہے:

اس طرح سر سید احمد خاں کی کتاب ''الخطبات احمدیہ'' کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ اسلام پر مستحکم ایمان رکھتے تھے۔ان کی کتاب ''تفسیر القرآن'' سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں قرآن مجید کو کتنا اہم اور بنیادی مقام حاصل ہے۔ان کی تفسیر سات جلدوں میں ہے۔

جولوگ ان کے مذہبی عقائد پر اعتراض کرتے تھے ان کا فرداً فرداً جواب وہ نہیں دے سکتے تھے اس لئے انہوں نے قرآن مجید کی تفسیر لکھ کر اپنے نظریات کی وضاحت کردی۔اس سلسلے میں ثریا حسین لکھتے ہیں:

''یوں تو سید احمد خاں اپنی متعدد تصانیف میں اسلام کے بیشتر مسائل سے متعلق اپنی آراء کا اظہار کر چکے تھے، مثلاً غلامی، تعداد ازدواج، وحی کی ماہیت، فرشتہ، شیطان اور معجزہ۔ جولوگ ان کے خیالات پر اعتراض کرتے تھے وہ سب دلیل کے طور پر قرآن کی آیتوں کو نقل کر کے ان کو اپنے نظریہ کے مطابق معنی دیتے تھے چونکہ وہ ہر معترض کا جواب فرداً فرداً نہیں دے سکتے تھے۔اس لئے انہوں نے یہ مناسب سمجھا کہ وہ خود قرآن پاک

کی ایک ایسی تفسیر لکھیں جس میں وہ اپنے نظریات کی بخوبی
وضاحت کر سکیں۔ انہیں کچھ ایسے علماء اور فضلا کی علمی استعانت
حاصل تھی جن پر وہ کلی اعتماد کر سکتے تھے۔''

(سرسید احمد اور ان کا عہد، ثریا حسین، ص:۱۳۱)

مذہبی موضوعات پر ان کے کئی مضامین ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' میں شائع ہوئے۔ ڈاکٹر ڈبلو ڈبلو ہنٹر نے ۱۸۷۱ء میں ایک کتاب ''ہمارے ہندوستانی مسلمان' لکھی تھی۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا کہ برطانوی حکومت کو مسلمانوں پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اسلام مسلمانوں کو غیر مسلموں کے خلاف جہاد کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کتاب سے ہندوستانی مسلمانوں کی حالت خراب ہونے کا ڈر تھا۔ اس طرح کے کئی دوسرے الزامات بھی مسلمانوں پر لگائے جا رہے تھے۔ سرسید احمد خاں نے انکے الزامات کا مدلل جواب دینے کے لیے مضامین کا یہ سلسلہ شروع کیا تھا۔ ''ہندوستانی مسلمان'' کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان بھی انگریزی حکومت کے اتنے ہی وفادار ہیں جتنے ہندوستان کے دوسرے لوگ۔ سرسید احمد نے انگریزوں کو بتایا کہ یہ بات بالکل غلط ہے کہ اسلام عام حالات میں غیر مسلموں کے خلاف جہاد کی تعلیم دیتا ہے۔ انہوں نے ڈاکٹر ہنٹر کے اس

الزام کی تردید کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ اسلام بلاوجہ حکومت وقت سے جہاد یا فوجی بغاوت پر آمادہ نہیں کرتا بلکہ صلح و دوستی کا سبق اور مل جل کر رہنے کی ترغیب دیتا ہے۔

مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے اور ان اعتراضات کا جواب دینے کے لئے جو دیگر مذاہب والے آنحضرتؐ کی ذات پر کر رہے تھے، سرسید احمد نے اس طرح کے مضامین لکھ کر ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' میں شائع کروائے۔

سرسید احمد خاں کو دیگر مصلحین کی طرح اپنی زندگی میں مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کسی کو ان سے ذاتی اختلاف نہ تھا بلکہ زیادہ تر اختلافات ان کے مذہبی معتقدات سے تھا۔ ان کے دور میں عام طور پر اسلام کی جو تفسیر پیش کی جاتی تھی وہ اسے تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ مسلمان اس اسلام کی تعلیمات پر عمل کریں جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے نزدیک مستند نہیں۔

تعلیمات اور اعمال کی درستی اور صحت پر سرسید احمد کی ضد نے ان کے خلاف ایک بڑا طوفان کھڑا کر دیا۔ انہیں کافر اور اسلام دشمن تک کہا گیا لیکن بعد میں ان کے اصلاحی خیالات سے چاہے وہ معاشرے سے متعلق ہوں یا مذہب سے، بہت سے لوگوں نے تائید کی اور ان کے وفات کے بعد تو ان کے موافقین کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی۔

تاریخ نویسی کے لحاظ سے سرسید احمد کا کارنامہ بے حد اہم ہے۔انہوں نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز تاریخ نویسی سے کیا تھا۔ان کی اس طرح کی تحریر میں تنگ نظری اور تعصب کا نام ونشان نہیں ہے۔ان کا کہنا تھا کہ اپنی قوم کی تاریخ کو بھول جانے سے زیادہ بے عزتی قوم کے لئے کیا ہوسکتی ہے۔

سرسید احمد خاں نے ''جام جم''، ''آثار الصنادید''، ''سلسلۃ الملوک''، ''تصحیح آئینۂ اکبری''، ''تصحیح تاریخ فیروز شاہی''، تصحیح تو زک جہانگیری وغیرہ جیسی اہم تاریخی کتابیں لکھیں۔

''جام جم'' میں تیمور بانی خاندان سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک ۴۳ فرماں رواؤں کے حالات تاریخی ترتیب کے ساتھ درج ہیں۔

''آثار الصنادید'' سرسید احمد خاں کی ایک ایسی تاریخی کتاب ہے جس کی آج تک مثال نہیں ملتی۔اس کتاب کے ذریعہ انہوں نے سلطنتوں کے عروج وزوال کا جائزہ لیا ہے۔اس کتاب کے ذریعہ تاریخ کے بہت سے مخفی پہلو سامنے آئے۔آگرہ اور دہلی کے کھنڈروں نے ان کے ذوق تاریخ کو نمایاں کیا۔انہوں نے خود لکھا ہے:

''اگر چہ لوگ یہ خیال ظاہر کریں گے کہ میں نے جو اس شہر کے

لوگوں کا حال لکھا ہے وہ بہ نظر حب الوطن ہوگا لیکن جن لوگوں
کے مزاج میں انصاف ہے وہ میری اس ساری کتاب کو دیکھ کر
جان لیں گے کہ میں نے جو حال لکھا ہے وہ افراط اور تفریط سے
خالی ہے۔ حقیقت میں یہاں کے لوگ ایسے ہیں کہ شاید اور کسی
اقلیم کے نہ ہوں گے۔ ہر ایک شخص ہزار ہزار خوبی کا مجموعہ اور
لاکھ لاکھ ہنروں کا گلدستہ ہے ہر ایک کو علم و ہنر سے شوق اور دن
رات لکھنے پڑھنے ہی سے ذوق ہے۔''

اس کے بعد ایک سوسترہ معاصر مشاہیر کا بیان ہے جن کے متعلق مصنف نے اعتراف
کیا کہ:

''اب میں تھوڑا سا بزرگان معاصرین علیہ الرحمہ کا جن کی فیض
خدمت میں مشرف ہوا ہوں یا اس زمانے میں ان کے وجود
سے عالم کو رونق تھی حال لکھتا ہوں۔''

(آثار الصنادید، سر سید احمد خاں، ص: ۱۴، ۱۵)

پہلے ایڈیشن میں جو کمی رہ گئی تھی اسے سر سید احمد نے دوسرے ایڈیشن میں پورا

کیا۔ انہیں تاریخ اور ثقافت سے ایسا لگاؤ تھا کہ خطرات مول لے کر اونچی اونچی عمارات پر لکھے ہوئے قدیم رسم الخط کے کتبے پڑھے اور بڑی مشکل سے اس کے چربے اتارے پھر تحقیق بھی کی کہ کون سی عمارت کس بادشاہ نے بنوائی۔

''مسلسلۃ الملوک'' میں دلی کے دو سو بادشاہوں کا سلسلہ راجہ یدھسٹر سے شروع ہو کر ۱۸۵۲ء تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کتاب میں مغلوں کا تذکرہ بھی ضمنی طور پر کیا گیا ہے۔

سرسید احمد خاں نے بڑی مہم جوئی اور کاوش کے بعد ''آئینہ اکبری'' کا صحیح تر نسخہ ''تصحیح آئینۂ اکبری'' کے نام سے کیا ہے۔ اصل ''آئینہ اکبری'' میں بہت سی غلطیاں تھیں انہیں سرسید احمد نے پر کیا اور تصویروں سے مزین کیا۔

''صحیح تاریخ فیروز شاہی'' لکھنے کے لیے بنگال رائل ایشاٹک سوسائٹی نے سرسید احمد سے فرمائش کی تھی۔ چنانچہ سرسید احمد نے ''تاریخ فیروز شاہی'' کا اصل نسخہ دہلی کتب خانے سے حاصل کیا اور ایک مستند نسخہ بڑے سائز کا باسٹھ صفحات پر مشتمل ''صحیح تاریخ فیروز شاہی'' کے نام سے شائع کروایا۔

''تصحیح توزک جہانگیری'' سرسید احمد کی ایک اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔

''توزک جہانگیری'' کے نام سے جہانگیر نے کتاب کا آغاز اپنی تخت نشینی سے کیا تھا اور اس میں اول سال جلوس سے سترہویں سال کے وسط تک احوال خود تحریر کیۓ بعد میں اس میں اضافے بھی کیۓ گئے تھے۔ سر سید احمد خاں نے مختلف نسخوں سے مقابلہ کرنے کے بعد مرزا ہادی کا دس صفحوں کا دیباچہ شامل کر کے ''تصحیح تاریخ فیروز شاہی'' کے نام سے شائع کروایا تھا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سر سید احمد خاں کو تاریخ نویسی کا کتنا شوق تھا۔ انہوں نے خود ہی ایک جگہ لکھا ہے:

> ''وہ قوم نہایت بدنصیب ہے جو اپنے بزرگوں کے ان کاموں کو جو یاد رکھنے کے قابل ہیں بھلا دے یا ان سے بے خبر رہے۔ ہماری تاریخیں اس زمانے کی لکھی ہوئی ہیں جب تاریخ نویسی کے فن کو پوری طرح ترقی نہیں ملی تھی۔ اس لیے ہمارے بزرگوں کے کاموں کے گوہر آبدار کہیں بکھرے پڑے ہوئے ہیں اور کہیں کوڑے کرکٹ میں اسے ملے ہیں۔''

(المامون۔ شبلی نعمانی، دیباچہ از سر سید احمد خاں، ص:۴)

مختصر یہ کہ سر سید احمد خاں نے اپنی تاریخ نویسی کے ذریعہ قدیم ہندوستان اور

قرون وسطی کے تہذیبی اور آساری سرمائے میں یکساں طور پر دلچسپی لے کر ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔

سرسید نے باقاعدہ سیاست پر کوئی علمی بحث نہیں کی ہے بلکہ ان کے سیاسی خیالات ان کے عہد کی دین تھے۔ انیسویں صدی کے ہندوستان میں سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور تعلیمی مسائل ایک دوسرے میں اس طرح پیوست تھے کہ ان میں ربط وتوازن پیدا کئے بغیر کوئی تحریک کامیاب نہیں ہوسکتی تھی۔ سرسید احمد خاں ایک ایسے قومی رہنما تھے جنہوں نے اجتماعی زندگی کے ہر پہلو پر غور کیا۔ انہیں دہلی کی سورش کی خبریں ملتی رہیں۔ ان کے خاندان کے لوگ وہیں تھے۔ وہ اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر بجنور سے میرٹھ پہنچے اور وہاں پانچ ماہ رکنے کے بعد پریشانی کی حالت میں دہلی آئے۔ جب دہلی پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ خاندان کے کچھ لوگ اور ایک عزیز دوست فرنگیوں کے ظلم کا نشانہ بن چکے ہیں۔ ان کی والدہ اور خالہ تین دن کی بھوکی پیاسی نوکر کی کوٹھری میں چھپی بیٹھی تھی۔ انہیں بڑی مشکل سے میرٹھ لائے جہاں ان کا ۱۸۵۷ء ہی میں انتقال ہوگیا۔ ان لرزہ خیز واقعات کا انہوں نے گہرا اثر قبول کیا۔ انہوں نے اپنے کرب کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''غدر کے بعد مجھ کو نہ اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا اور نہ مال واسباب

کے تلف ہونے کا جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی اور

ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گذرا اس کا رنج

تھا۔ جب ہمارے دوست مرحوم شیکسپئر جن کی مصیبتوں میں ہم

اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک تھے بعد میں اس وفاداری

کے صلہ میں جہاں آباد جو سادات کا ایک نہایت نامی خاندان

کی ملکیت تھا اور لاکھ روپے سے زیادہ کی مالیت کا تھا مجھ کو دینا

چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں

کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو

بربادی ہو اور میں ان کی جائداد لے کر تعلقدار بنوں۔ میں نے

اس کے لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں

رہنے کا نہیں ہے۔''

(سرسید احمد خاں کے لکچروں کا مجموعہ بحوالہ سرسید احمد خاں اور ان کا

عہد، ص: ۳۰۰)

جب حالات کچھ بہتر ہوئے تو ۱۸۵۷ء ہی میں بحیثیت صدر الصدور مراد آباد

گئے۔ وہاں کی حالت دیکھ کر وہ بے حد پریشان ہوئے اور وہیں رہ کر قوم کی اصلاح کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اپنے وطن میں رہ کر انہوں نے مسلمانان ہند کے لیے دو تدبیریں اختیار کیں۔ پہلی یہ کہ ہندوستانیوں میں مغربی تعلیم کو فروغ دینا تا کہ ان کی زبوں حالی اور پسماندگی جاتی رہے۔ اس مقصد سے انہوں نے مراد آباد میں ایک مدرسہ کھولا۔ غازی پور کا اسکول ہی اس سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ دوسرا یہ کہ ایسے رسالے لکھنا جس سے انگریزوں کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں جو ہندوستانیوں کی طرف سے پیدا ہوگئی تھیں۔ اس تعلق سے انہوں نے تین کتابیں لکھیں:

(۱) سرکشی ضلع بجنور

(۲) اسباب بغاوت ہند

(۳) لائل محمڈنز آف انڈیا

''سرکشی ضلع بجنور'' میں سرسید احمد نے مسلمانوں کے مسائل کو غدر کے پس منظر میں دیکھا اور ایسا لائحہ عمل پیش کیا جو ان کی ترقی کا باعث بنا۔ اس کتاب سے سرسید احمد کا سیاسی موقف منظر عام پر آیا۔ انہوں نے کتاب کے آخر میں اپنی قوم کے لوگوں کو باخبر رہنے، زمانہ کے ساتھ چلنے اور آنے والی زندگی کے بارے میں معروضی انداز سے سوچنے

کی دعوت دی۔ اس کتاب سے انگریزوں کے سنجیدہ حکام نے اپنی پالیسیوں میں نظرثانی کرنے پر بھی آمادگی ظاہر کی۔

''رسالہ اسباب بغاوت ہند'' لکھ کر سرسید احمد نے انگریزوں کو غدر کی صحیح صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ جانتے تھے کہ انگریزوں کو اس بغاوت کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ اس لیے انہوں نے صحیح صورت حال سے انہیں آگاہ کیا جس کی وجہ سے سرسید احمد کی پیش کردہ بہت سی تجاویز پر عمل درآمد ہوا۔

''لائل محمڈنز آف انڈیا'' سرسید احمد نے انگریزوں سے باہمی منافرت کی خلیج کو پاٹنے اور مسلمانوں پر عائد کردہ الزامات کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے یہ ششماہی رسالہ جاری کیا تھا۔ اس رسالہ میں بائیس ایسے خیرخواہوں کے نام اور حالات درج ہیں جنہوں نے اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر حکومت سے وفاداری کی۔ دوسری بات یہ بتائی کہ غدر کی کوئی مذہبی حیثیت نہ تھی اس لیے اس پر جہاد کا اطلاق نہیں ہوتا۔

اس طرح سرسید احمد نے ان تینوں کتابوں کے ذریعہ اپنی سیاسی بصیرت کا وہ ثبوت پیش کیا ہے جو اس وقت دوسرے کوئی ہندوستانی پیش نہ کر سکے۔ سرسید احمد کی سیاسی تحریریں مدافعانہ ہیں۔ انہوں نے ان کے ذریعہ یہ ثابت کیا کہ ہندوستانی باغیانہ

سرگرمیوں میں شامل نہیں تھے بلکہ یہ سب حالات کا تقاضا تھا۔ انگریز حکمراں ہی اس کے ذمہ دار تھے۔

سرسید احمد خاں کے بغاوت کے محرکات کو ثریا حسین نے اس طرح پیش کیا ہے:

''سید احمد خاں کے نزدیک بغاوت کے خاص خاص محرکات میں ہندوستانیوں کی اعلیٰ مراتب میں عدم شمولیت، ان کے رسم ورواج اور مذاق کے خلاف قوانین کی تشکیل اور حکومت برطانیہ کی ان کے حالات و جذبات سے ناواقفیت تھی۔ ''رسالہ اسباب بغاوت ہند'' میں مصنف کی پیش کردہ بہت سی تجاویز پر عمل درآمد ہوا۔ مثلاً سید احمد خاں کی تجویز پر ۱۸۶۱ء میں ہندوستانیوں کو قانون ساز مجلس (کاؤنسل) کا ممبر منتخب کیا گیا اور ۱۸۶۲ء کے اجلاس کاؤنسل میں پہلی بار مہاراجہ نریندر دیو (پٹیالہ) راجہ دیونراین سنگھ رئیس بنارس اور راجہ دنکر راؤ دیوان ریاست گوالیار بحثیت رکن شریک ہوئے۔ اس کے علاوہ

انہوں نے ہندوستانیوں کو اعلیٰ عہدے نہ ملنے کی بھی شکایت کی

تھی تو ۱۸۶۲ء میں پہلی بار شمبھو ناتھ ہائی کورٹ کے جج مقرر

ہوئے۔''

(سرسید احمد خاں اور ان کا عہد، ثریا حسین ص: ۳۰۴)

سرسید احمد خاں نے نہ صرف صحافت میں قدم جما کر اپنی اہمیت کا احساس دلایا ہے بلکہ اس کے ذریعہ قوم کی اصلاح کی ہے۔ انہیں روشن دنیا سے روشناس کرایا ہے۔ ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' اور ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعہ انہوں نے اردو صحافت کو بلندی پر پہنچایا۔ اول الذکر میں انگریزوں کے چند اہم اخباروں کی خبروں اور مضامین کے ترجمے شائع ہوتے تھے۔ حالات حاضرہ پر بے باک تبصرے کئے جاتے تھے۔ اس گزٹ میں تعلیم، تاریخ، سیاست، مذہب، ادب، سائنس اور دوسرے کئی اہم موضوعات پر طبع زاد اور ترجمہ شدہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ سرسید احمد خاں نے اخبار کو کیا ہونا چاہئے اور اس کا مقصد کیا ہونا چاہئے پر اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''اردو زبان کی بے بضاعتی اور مفلسی کے ذمہ دار بھی انگریزی

تعلیم یافتہ نوجوان ہیں.....انگریزی تعلیم یافتہ بنگالیوں نے اپنی

زبان کو یورپ کی زبانوں کے ذخیرے سے مالا مال کردیا۔

پروفیسر شبلی نے اس خیال کے مطابق ایک دردناک واقعہ اردو

زبان بولنے والے انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کی بے توجہی کا

بیان کیا اور خواہش ظاہر کی کہ یوروپین مصنفوں کے اعلیٰ

مقالات کا لفظی ترجمہ کر دیا جاوے جن میں ان کی مخصوص

خوبیاں پائی جاتی ہیں جو انگریزی جاننے والے اور ان خوبیوں

سے بہرہ اندوز ہونے اور ان سے اپنی اردو زبان کو بھر دینے کا

موقع ملے گا۔''

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ۔سر سید احمد خاں۔۴ر جولائی ۱۸۹۲ء ص:۶۵۴)

''تہذیب الاخلاق'' کے بارے میں پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ سرسید نے اس

رسالے کو قوم کی ذہنی تربیت کے لیے جاری کیا تھا۔ اس کے لئے انہوں نے خود بھی

مضامین لکھے اور دیگر اہل قلم کی تحریریں بھی شامل کی گئیں۔ مغربی دانشوروں کے انگریزی

مضامین کے اردو ترجمے بھی شائع کئے گئے۔

سر سید احمد کے خطوط کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے خطوط کے مطالعہ کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے مبالغہ آرائی، مقفیٰ و مسجع انداز بیاں کے بجائے اثر آفرینی کو ضروری سمجھا ہے۔ ان کے خطوں میں سادگی و سلاست جامعیت اور اختصار ہے۔ انہوں نے القاب و آداب کا کوئی خاص اہتمام نہیں کیا ہے۔ سادہ اور برمحل القاب کی وجہ سے ان کے یہاں یگانگت اور گرم جوشی پیدا ہوگئی ہے۔ ان کے خطوط میں ان کی شخصیت کے نمایاں اوصاف جیسے سادگی، معصومیت، مستقل مزاجی اور محنت و ایثار دیکھے جاسکتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

''سر سید کی ادبی تحریک اور ان کے شخصی رنگ خط نگاری نے بھی خاص حد تک اردو خط و کتابت پر اثر ڈالا۔ سر سید جس طرح نثر میں مدعا اور مقصد کے داعی ہیں اسی طرح خط نگاری میں بھی مقصد ہی کے علمبردار ہیں۔ انہوں نے اپنے مضامین تہذیب الاخلاق میں خود اس کا ذکر کیا ہے کہ وہ صرف کام کی باتیں کہنا چاہتے تھے اور عبارت آرائی، تکلف اور اطناب بے مقصد سے احتراز کرتے ہیں۔ ان کے خط ان کی عام نثر کے مقابلہ میں

زیادہ شگفتہ ہیں.....بہر حال یہ مسلم ہے کہ سرسید نے اردو خطوط
نگاری کو مضمون کی قطعیت، زبان کی سادگی اور تخاطب کے
خلوص سے آشنا کیا۔"

(میر امن سے عبدالحق تک۔ سید عبداللہ، چمن بک ڈپو دہلی، ص: ۱۹۵)

سر سید احمد خاں کا "سفر نامہ پنجاب" بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے ۲۲ جنوری ۱۸۸۴ء کو پنجاب کا سفر شروع کیا اور دوران سفر ملک کے تعلیمی حالات کو درست کرنے کے لئے پر جوش تقریریں کیں اور مدرسۃ العلوم کے لئے چندہ جمع کیا۔ یہ سفر نامہ قومی جدوجہد کی ایک مختصر روداد ہے۔ جس کا مقصد تعلیمی مشن کو فروغ دینا اور قوم کو مغربی تعلیم سے آراستہ کرنا تھا۔ دوران سفر سرسید احمد نے ہندو مسلمان اراکین، آریہ سماج اور ہندو مہا سبھا نیز اسکول و کالج کے لڑکیوں سے ملاقاتیں کیں اور سب کا دل اپنی دردمندی اور حق گوئی سے جیتا اور اپنا پیغام علم و عمل دوسری تک پہنچایا اور ان میں ایک نئی تحریک پیدا کی۔

اب تک کے جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ سرسید احمد کے مضامین کے علاوہ ان کی جو تحریریں سامنے آئی ہیں وہ مذہبی، تاریخی اور سیاسی نوعیت کی ہیں۔ ان سے ہٹ کر

جب ہم سر سید احمد کے مضامین کا مطالعہ کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے سارے مضامین قوم کی اصلاح کے لئے لکھے۔ پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد پوری قوم تباہی کے دہانے پر کھڑی تھی۔ سر سید احمد نے اپنے مضامین کے ذریعہ انہیں صحیح راستے پر لانے کی کوشش کی۔ انہوں نے قوم کی جہالت، کاہلی، ریاکاری اور تقلید پرستی کو دیکھتے ہوئے ان موضوعات پر مضامین لکھے تاکہ قوم انہیں پڑھ کر اپنی اصلاح کر سکے۔ مسلمانوں کے اندر تعصب اور غلط رسم و رواج پوری طرح گھر کر چکے تھے۔ ان کا اخلاق پوری طرح گر چکا تھا۔ سر سید احمد نے اپنے مضامین کے ذریعہ اپنی قوم کو سمجھانے کی کوشش کی:

"جس شخص میں اخلاق ہے اور اعتقاد نہیں وہ شخص بہ نسبت اس شخص کے جس میں اعتقاد ہے اور اخلاق نہیں، انسان کے لیے دنیا میں بہت زیادہ بہتری کر سکتا ہے اور میں اس قدر اور زیادہ کہتا ہوں کہ انسان کے لیے دین اور دنیا دونوں میں بھلائی کر سکتا ہے۔"

(اخلاق۔ مشمولہ انتخاب مضامین سر سید، ص:۶۱)

سر سید احمد نے معاشرتی اصلاح کے لئے کئی مضامین لکھے۔ انہوں نے اپنی

قوم کو بتایا کہ وہ اپنے دماغ میں لغو خیالات کو نہ لائیں جن کی وجہ سے بہت سے لوگوں کی عقل اور سمجھ ماند پڑ گئی ہے۔

سرسید احمد نے سب سے زیادہ زور مسلمانوں کی تعلیم پر دیا۔ انہوں نے اس سلسلے میں کئی مضامین لکھے جیسے ''تعلیم''، ''قدیم تعلیم''، ''تعلیم نسواں'' وغیرہ۔ اس وقت پوری قوم جہالت کے اندھیرے میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ سرسید احمد نے انہیں بتایا کہ تعلیم کے بغیر دنیا کی کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ انہوں نے کہا کہ آج دنیا کی جو قومیں ترقی یافتہ ہیں سب نے تعلیم حاصل کی ہے۔ بغیر تعلیم حاصل کئے کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی اور نہ اپنا اونچا مقام حاصل کر سکتی ہے۔ انہوں نے تعلیم کے تعلق سے ایک بات یہ بھی کہی کہ جس ملک کی جو زبان ہوتی ہے اس زبان کو سیکھنا اور اس میں مہارت حاصل کرنا ضروری ہے کیونکہ کسی قوم کی یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

مسلمان انگریزی تعلیم سے ناواقف تھے اور اسے عیسائیوں کی زبان قرار دے کر اس کے قریب جانا نہیں چاہتے تھے۔ یعنی انگریزی زبان پڑھنے اور لکھنے کو وہ اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ سرسید احمد نے ان کے دل سے اس بات کو اپنے مضامین کے ذریعہ نکالنے کی کوشش کی۔ لکھتے ہیں:

''ہم نے اپنے دل کواور اپنے اندرونی قویٰ کو بالکل خراب کر دیا ہے۔علم جو حاصل کرتے ہیں وہ بھی بعوض اس کے کہ روحانی قویٰ کو شگفتہ و شاداب کرے ان کو پژمردہ کر دیتا ہے اور ہمارے قویٰ کو جو درحقیقت سرچشمے تمام نیکیوں کے ہیں بالکل کمزور اور ناکارہ کر دیتا ہے اور ہماری حالت تمام معاملات میں کیا دین کے اور کیا دنیا کے خراب ہوتی چلی جاتی ہے پس ہم کو اپنے پر رحم کرنا چاہئے اور ایسی تعلیم کو اختیار کرنا چاہئے جو اندرونی قویٰ کو شگفتہ وشاداب کرے اور دل کے سوتوں کو کھول کر سرجی چشمہ سے پانی باہر نکالے جس سے ہماری زندگی سرسبز وشاداب ہو۔''

(تعلیم وتربیت ۔سرسید احمد، مشمولہ انتخاب مضامین سرسید، مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور، ص:۵۶)

سرسید احمد چاہتے تھے کہ مشرق کی ہر عمدہ چیز کی قدر کی جائے۔مشرقی تہذیب وتمدن کی قدر کی جائے۔مگر مغرب سے بھی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے اور

انگریزی زبان سیکھنی چاہئے۔فرماتے ہیں:

''مسلمانوں کو بھی یہ لازم ہے کہ عربی زبان کی تحصیل نہ چھوڑیں یہ ہمارے باپ دادا کی مقدس زبان ہے۔ وہ فصاحت وبلاغت میں سمٹک زبان لاثانی ہے۔اس زبان میں ہمارے مذہب کی ہدایتیں ہیں لیکن جیسا کہ ہماری معاشی، ہماری بہتری، ہماری زندگی بہ آرام بسر کرنے کے ذریعہ بلکہ ہمارے اس زمانے کے موافق انسان بنانے کے وسائل انگریزی زبان سیکھنے میں ہیں تو ہم کو اس طرف بہت توجہ کرنی چاہئے۔''

(بحوالہ سرسید احمد خاں اور ان کا عہد، ثریا حسین، ص:۳۱۲،۳۱۳)

سرسید احمد تعلیم کو روزی روٹی سے جوڑنا چاہتے تھے۔ دراصل ان کے زمانے میں مسلمانوں کا زوال انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ پہلی جنگ آزادی کے بعد مسلمان ہی انگریزی حکمرانوں کے غیض وغضب کے شکار ہوئے تھے۔انگریزی حکومت مسلمانوں کی طرف سے اتنی بدگمان ہوگئی تھی کہ وہ انہیں اپنا دشمن سمجھنے لگی تھی۔ان کی زمینداری، جاگیرداری اور

بڑے عہدے چھین لیے گئے تھے۔ سر سید احمد ان باتوں سے بہت دکھی تھے۔ وہ اپنی قوم کا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنے مضامین کے ذریعہ ان کے اندر ایک نئی روشنی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کے مضامین کے موضوعات مسلمانوں کی تباہی، ان کی جہالت، ان کے گمراہ کن عقائد، اندھی عقیدت اور غلط رسم و رواج، آپسی نفاق، ظاہر داری، مذہبی عقائد، خواتین کی تعلیم اور ان کی بہتری اور دنیا سے بے تعلقی کے نقصانات وغیرہ ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے سر سید احمد کے مضامین بہت اہم ہیں۔ انہوں نے اپنے مضامین کے ذریعہ اپنے قوم کی اصلاح کرنے کی کوشش کی۔ ابتدا میں وہ مذہب، تاریخ اور سیاست پر اپنی ساری توجہ مرکوز کئے ہوئے تھے لیکن غدر کے بعد انہوں نے اپنے مضامین کے ذریعہ اپنی قوم کو اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔

جب ہم سر سید احمد کے مضامین میں پائے جانے والے زبان و اسلوب سے ان کی دوسری تحریروں کا موازنہ کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ ان کی دوسری تحریروں کی ابتدائی نثر پرانے رنگ کی ہے اور اس کے بعد والی تحریروں میں مغربی طرز زندگی اور جدید خیالات کا تھوڑا بہت اثر دکھائی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی دوسری تحریروں میں مناظرہ، تقابل، مذاہب وغیرہ کا رنگ زیادہ گہرا ہے۔ دراصل ان کی ابتدائی تحریروں میں ان کا نظریہ خالص

علمی اور دینی تھا۔ ابتدا میں آثار قدیمہ سے بھی ان کی خاصی دلچسپی تھی۔ اس دور میں انہوں نے قدیم موضوعات کو نئے طرز بیان سے روشناس کرایا۔ لیکن مضامین کے ذریعہ وہ پر تکلف فارسی اسالیب سے اردو نثر کو آزاد کرانے کی کوشش کرنے لگے اور اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ انہوں نے اردو نثر کو اپنے مضامین کے ذریعہ اپنی زندگی ہی کا نہیں بلکہ پورے معاشرہ کا ترجمان بنایا۔ ان کے مضامین میں ان کی دوسری تحریروں سے زیادہ سادگی اور سلاست ہے۔ کہیں کہیں تو افسانوی رنگ ابھر آیا ہے۔ ''گزرا ہوا زمانہ''، ''امید کی خوشی''، ''بحث و تکرار'' اور ''سراب حیات'' وغیرہ میں اس رنگ کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔

> ''پھر وہ اپنی جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا۔ اپنا سرخ سفید چہرہ، سڈول بھرا بھرا بدن، رسیلی آنکھیں، موتی کی لڑی سے دانت، امنگ میں بھرا ہوا دل، جذبات انسانی کے جوش کی خوشی اسے یاد آتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ زمانہ میں ماں باپ جو نصیحت کرتے تھے اور نیکی اور خدا پرستی کی بات بتاتے تھے اور یہ کہتا تھا'' آہ ابھی بہت وقت ہے''۔ اور بڑھاپا

آنے کا کبھی خیال بھی نہیں کرتا تھا۔ اس کو یاد آتا تھا اور افسوس
کرتا تھا کہ کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی میں اس وقت کا خیال کرتا
اور خدا پرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا اور موت کے لئے
تیار رہتا۔ آہ وقت گذر گیا۔ آہ وقت گذر گیا۔ اب پچھتائے کیا
ہوتا ہے۔ افسوس میں نے آپ اپنے تئیں ہمیشہ یہ کہہ کر برباد کیا
کہ ابھی وقت بہت ہے۔"

(گزرا ہوا زمانہ، سرسید احمد مشمولہ انتخاب مضامین سرسید
مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور، ص:۸۰)

اس طرح سرسید احمد نے اپنے مضامین میں موضوع اور خیال کی مناسبت سے اسلوب اختیار کیا ہے۔ ان کے مضامین میں برجستہ جملے اور فقرے کے ساتھ ساتھ زور بیان کی شادابی بھی ہے۔ کہیں کہیں ڈرامائی شان بھی موجود ہے۔ انہوں نے اپنے مضامین میں موقع کی مناسبت سے محاورے اور ضرب الامثال کا استعمال کیا ہے۔ ان کے مضامین کی زبان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ضرورت کے مطابق دوسری زبان کے الفاظ کو بھی اردو میں شامل کیا ہے۔

سرسید احمد کی دوسری تحریروں میں معروضی طرز بیان اختیار کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ وہ اسلام پر مستحکم ایمان رکھتے تھے اور اسلام کے خلاف بولنے والے کی مدلل تردید کرتے تھے۔ نئی نسل کی رہبری اور اسلامی فکر کی تشکیل جدید میں ان کی تحریریں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔ وہ تاریخ کے تہذیبی تسلسل کے قائل تھے۔ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ قدیم ہندوستان اور قرون وسطیٰ کے تہذیبی اور آثاری سرمائے میں یکساں دلچسپی لی اور دہلی کے آثار قدیمہ کے تحفظ کی عملی کوششیں کیں۔ تحقیق کرنے والوں کے لیے ان کی کوششیں بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انہوں نے اردو میں سنجیدہ علمی تحریر لکھنے کا رواج ڈالا۔ زندگی کے بیشتر شعبوں میں انہوں نے حرکت و عمل کی روح پھونک دی اور تہذیب کا ایک وسیع تصور عام کیا اور علمی نثر کو فروغ دیا۔

☆☆☆

کتابیات

Bibliography

کتابیات

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف/مرتب	مطبع	مقام اشاعت	سن
۱۔	اصول تحقیق وترتیب ومتن	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	دہلی	۱۹۹۴ء
۲۔	ارباب نثر اردو	سید محمد	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس	دہلی	۱۹۷۷
۳۔	ادب کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر سلام سندیلوی	نسیم بک ڈپو	لکھنو	۱۹۷۳ء
۴۔	ادبی اشارے	ڈاکٹر سلام سندیلوی	نسیم بک ڈپو	لکھنو	۱۹۶۹ء
۵۔	اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ	سنبل نگار	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	علی گڑھ	۱۹۹۹ء
۶۔	اردو اسالیب نثر	امیر اللہ شاہین	جمال پرنٹنگ پریس	دہلی	۱۹۷۷ء
۷۔	اردو نثر میں ادب لطیف	ڈاکٹر عبدالودود خاں	نسیم بک ڈپو	لکھنو	۱۹۸۰ء
۸۔	اردو اور قومی تذکرے	کشن پرساد کول	انجمن ترقی اردو ہند	علی گڑھ	۱۹۸۲ء
۹۔	اصناف ادب اردو	ڈاکٹر قمر رئیس	سرسید بک ڈپو	علی گڑھ	۱۹۸۲ء
۱۰۔	اردو زبان اور فن داستان گوئی	کلیم الدین احمد	ادارۂ فروغ اردو	لکھنو	۱۹۷۲ء

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	مقام	سن
۱۱۔	اردو شاعری کا سماجی پس منظر	ڈاکٹر سید اعجاز حسین	تاج آفسٹ پریس	الہ آباد	۱۹۷۳ء
۱۲۔	آج کا اردو ادب	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	علی گڑھ	۱۹۷۵ء
۱۳۔	اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام	مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اردو ہند	علی گڑھ	۱۹۶۸ء
۱۴۔	اردو کی قدیم داستانیں	ایم حبیب خاں	یوپی اردو اکادمی	لکھنو	۱۹۷۴ء
۱۵۔	اردو زبان وادب	شفیق الزماں	مسلم اسٹوڈنٹ ایسوسی ایشن	پٹنہ	۱۹۸۴ء
۱۶۔	اردو کی نثری تاریخ میں سرسید کا مقام	سید سلطان محمود	نعمان پریس	دہلی	۱۹۷۷
۱۷۔	اردو کا آغاز وارتقا	ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ	مجلس تحقیقات	حیدرآباد	۱۹۹۱ء
۱۸۔	اردوئے قدیم	حکیم شمس اللہ قادری	نولکشور پریس	لکھنو	۱۹۶۷ء
۱۹۔	اردو انسائیکلو پیڈیا	قومی کونسل	قومی کونسل برائے فروغ اردو	دہلی	۱۹۹۶ء
۲۰۔	ازالتہ العین عن ذوالقرنین	سرسید احمد	مفید عام پریس	آگرہ	۱۹۸۹ء
۲۱۔	اسباب بغاوت ہند	سرسید احمد	یونیورسیٹی پبلشرز	علی گڑھ	۱۹۵۸ء
۲۲۔	اسلوب	عابد علی عابد	ایجوکیشنل بک ہاؤس	علی گڑھ	۱۹۷۶ء
۲۳۔	انتخاب مضامین سرسید	مرتبہ عتیق صدیقی	اتر پردیس اکادمی	لکھنو	۱۹۸۳ء

۲۴۔ ادبی تنقید کے اصول | کلیم الدین احمد | مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ | دہلی | ۱۹۸۵ء

۲۵۔ انقلاب ۱۸۵۷ تصویر کا دوسرا رخ | شیخ حسام الدین | اتر پردیش اردو اکادمی | لکھنو | ۱۹۹۱ء

۲۶۔۔انتخاب مضامین علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ | مرتبہ اصغر عباس | اتر پردیش اردو اکادمی | لکھنو | ۱۹۷۲ء

۲۷۔ اردو کے چند نامور ادیب و شاعر | ڈاکٹر حامد اللہ ندوی | موڈرن پبلشنگ ہاؤس | دہلی | ۱۹۹۵ء

۲۸۔ اعمال نامہ | سر رضا علی | ہندوستانی پبلشرز | دہلی | ۱۹۴۳ء

۲۹۔ بہار میں تخلیقی نثر | ڈاکٹر قیام نیر | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | ۲۰۱۴ء

۳۰۔ اردو نثر ایک مطالعہ | قاضی مشتاق احمد | موڈرن پبلشنگ ہاؤس | دہلی | ۲۰۰۵ء

۳۲۔ بہار میں اردو نثر کا ارتقا | مظفر اقبال | کتاب خانہ | پٹنہ | ۱۹۸۰ء

۳۳۔ تاریخ ادب اردو | رام بابو سکسینہ | نولکشور پریس | لکھنو | تیسرا

۳۴۔ تنقیدی تقاضے | ڈاکٹر مشتاق احمد | ادارہ جہاں اردو | دربھنگہ | ۲۰۰۳ء

۳۵۔ تاریخ ادب اردو حصہ اول | جمیل جالبی | ایجوکیشنل بک ہاؤس | دہلی | ۱۹۷۷ء

۳۶۔ تنقیدی جہات | ڈاکٹر شہزاد انجم | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | ۲۰۱۱ء

۳۷۔ تنقیدی گوشے | ڈاکٹر رئیس انور | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | ۲۰۱۱ء

۳۸۔ تنقید کی زبان — ڈاکٹر کمال الدین — دی آزاد پریس — پٹنہ — ۲۰۰۰ء

۳۹۔ تاریخ ادب اردو — ڈاکٹر وہاب اشرفی — ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس — دہلی — ۲۰۰۸ء

۴۰۔ تجربہ و تجزیہ — ڈاکٹر سلام سندیلوی — نسیم بک ڈپو — لکھنو — ۱۹۷۱ء

۴۱۔ جدید اردو ادب کا بانی — ابواللیث صدیقی — مسلم یونیورسٹی — علی گڑھ — ۱۹۳۸ء

۴۲۔ جادۂ اعتدال — عبدالمغنی — آرٹ پریس — پٹنہ — ۱۹۷۲ء

۴۳۔ حیات جاوید — الطاف حسین حالی — ترقی اردو بیورو — دہلی — ۱۹۷۹ء

۴۴۔ داستان تاریخ اردو — حامد حسن قادری — لکشمی پریس — آگرہ — ۱۹۶۶ء

۴۵۔ ریسرچ کیسے کریں — ڈاکٹر نورالاسلام صدیقی — شاد پبلی کیشنز — دہلی — ۱۹۹۰ء

۴۶۔ زاویۂ نگاہ — خلیل الرحمٰن اعظمی — آدرش پبلشرز — گیا — ۱۹۶۶ء

۴۷۔ سرسید (کتابچہ) — خلیق احمد نظامی — رعنا پبلشرز نئی دہلی — نئی دہلی — ۱۹۷۴ء

۴۸۔ سرسید احمد خاں — ظہیرالدین احمد — ادارۂ ادبیات — حیدرآباد — ۱۹۳۹ء

۴۹۔ سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا کی نثر کا فکری اور فنی جائزہ — ڈاکٹر سید عبداللہ — چمن بک ڈپو — دہلی — ۱۹۶۰ء

۵۰۔ سرسید احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ — عتیق صدیقی — مکتبہ جامعہ لمیٹڈ — نئی دہلی — ۱۹۷۷ء

۵۱۔ سرسید اور ہندوستانی مسلمان	نورالحسن نقوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس	علی گڑھ	۱۹۷۹ء
۵۲۔ سرسید اور علی گڑھ تحریک	خلیق احمد نظامی	ایجوکیشنل بک ہاؤس	علی گڑھ	۱۹۷۹ء
۵۳۔ سرسید احمد خاں کا سفرنامہ پنجاب	طبع دوم	ایجوکیشنل بک ہاؤس	علی گڑھ	۱۹۷۹ء
۵۴۔ سرسید احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ	عتیق صدیقی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	دہلی	۱۹۷۷ء
۵۵۔ سرسید کی تعلیمی تحریک	اختر الواسع	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ	دہلی	۱۹۸۵ء
۵۶۔ سرسید تاریخی وسیاسی آئینے میں	ڈاکٹر شان محمد	انور بک ڈپو	علی گڑھ	۱۹۶۷ء
۵۷۔ سرسید کی صحافت	اصغر عباس	انجمن ترقی اردو	دہلی	۱۹۷۵ء
۵۸۔ سرسید کی یاد	حبیب الرحمٰن خاں شروانی	مسلم یونیورسیٹی پریس	علی گڑھ	۱۹۲۵ء
۵۹۔ سرسید کے خطوط	مرتبہ وحیدالدین سلیم	حالی پریس	پانی پت	۱۹۰۱ء
۶۰۔ سرسید شاہ امین الدین اعلیٰ	حسینی شاہد	انجمن ترقی اردو	حیدرآباد	۱۹۷۳ء
۶۱۔ علی گڑھ تحریک	مرتبہ نسیم قریشی	مسلم پریس	لکھنو	۱۹۶۰ء
۶۲۔ علی گڑھ ماضی وحال	رشید احمد صدیقی	مسلم یونیورسیٹی	علی گڑھ	۱۹۷۰ء
۶۳۔ غدر کی صبح وشام	خواجہ حسن نظامی	ہمدرد پریس	دہلی	

۶۴۔ فسانۂ عجائب	رجب علی بیگ سرور	صفیہ اکیڈمی	کراچی	۱۹۶۷ء
۶۵۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات	ڈاکٹر عبیدہ بیگم	نصرت پبلیشرز	لکھنو	۱۹۸۳ء
۶۶۔ قدیم دلی کالج	مالک رام	جمال پرنٹنگ پریس	دہلی	۱۹۷۶ء
۶۷۔ کاروان صحافت	ڈاکٹر عبدالسلام خورشید	انجمن ترقی اردو	دہلی	۱۹۶۴ء
۶۸۔ کربل کتھا	فضل علی فضلی	ادارۂ تحقیقات اردو	پٹنہ	۱۹۶۵ء
۶۹۔ کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ	وحید قریشی	مکتبہ ادب جدید	لاہور	۱۹۶۵ء
۷۰۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد	محمد عتیق صدیقی	انجمن ترقی اردو	علی گڑھ	۱۹۶۰ء
۷۱۔ گنج خوبی	ترجم خواجہ احمد فاروقی	دہلی یونیورسیٹی	دہلی	۱۹۶۶ء
۷۲۔ مرحوم دہلی کالج	عبدالحق	ترقی اردو ہند	دہلی	۱۹۴۵ء
۷۳۔ مسافران لندن	سید احمد خاں	مجلس ترقی ادب	لاہور	۱۹۶۰ء
۷۴۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل	سید طفیل احمد	کتب خانہ عزیزیہ	دہلی	۱۹۵۴ء
۷۵۔ مضامین سر سید احمد خاں	عبدالحق	ایجوکیشنل بک ہاؤس	علی گڑھ	۱۹۸۴ء
۷۶۔ مقالات سرسید	عبداللہ خاں خویشگی	نیشنل پرنٹرس	علی گڑھ	۱۹۵۲ء
۷۷۔ مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	ایجوکیشنل بک ہاؤس	علی گڑھ	۱۹۷۷ء

۷۸۔ مکاتیب سرسید احمد خاں | مرتبہ مشتاق حسین | یونین پرنٹنگ پریس | دہلی | ۱۹۶۰ء

۷۹۔ ملا وجہی | جاوید وششٹ | ساہتیہ اکادمی | دہلی | ۱۹۸۵ء

۸۰۔ نظر اور نظریے | آل احمد سرور | مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ | دہلی | ۱۹۷۳ء

۸۱۔ نوطرز مرصع | مرتبہ نورالحسن ہاشمی | ہندوستان اکادمی | الہ آباد | ۱۹۵۸ء

۸۲۔ نئے اور پرانے چراغ | آل احمد سرور | ادارۂ فروغ اردو | لکھنو | ۱۹۶۳ء

۸۳۔ ہماری داستانیں | وقار عظیم | اردو مرکز | لاہور | ۱۹۶۴ء

۸۴۔ ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں | عابد حسین | مکتبہ جامعہ لیمیٹیڈ | دہلی | ۱۹۶۶ء

۸۵۔ ہندوستانی مسلم سیات پر ایک نظر | محمد اشرف | نئی روشنی پرکاشن | دہلی | ۱۹۶۳ء

☆☆☆

رسائل وجرائد

۱۔ آج کل	دہلی	اگست	۱۹۸۰ء
۲۔ آج کل	دہلی	نومبر	۱۹۸۱ء
۳۔ آج کل	دہلی	اگست	۱۹۸۲ء
۴۔ آہنگ	گیا	شمارہ ۳	۱۹۷۰ء
۵۔ آہنگ	گیا	شمارہ ۵	۱۹۷۰ء
۶۔ آہنگ	گیا	شمارہ ۹	۱۹۷۱ء
۷۔ آہنگ	گیا	شمارہ ۳۷	۱۹۷۳ء
۸۔ آہنگ	گیا	شمارہ ۶۱	۱۹۷۵ء
۹۔ الفاظ	علی گڑھ	مئی، جون	۱۹۷۸ء
۱۰۔ الفاظ	علی گڑھ	جنوری تا اپریل	۱۹۸۱ء
۱۱۔ زبان وادب	پٹنہ	اگست تا دسمبر	۱۹۸۰ء
۱۲۔ زبان وادب	پٹنہ	جولائی تا ستمبر	۱۹۸۴ء

۱۳۔ زبان وادب	پٹنہ	جولائی تا ستمبر	۱۹۸۶ء
۱۴۔ زبان وادب	پٹنہ	اگست	۲۰۰۵ء
۱۵۔ زبان وادب	پٹنہ	اکتوبر	۲۰۰۹ء
۱۶۔ زبان وادب	پٹنہ	ستمبر	۲۰۱۲ء
۱۷۔ زبان وادب	پٹنہ	نومبر	۲۰۱۲ء
۱۸۔ زبان وادب	پٹنہ	جنوری	۲۰۱۳ء
۱۹۔ شاعر	ممبئی	افسانہ نمبر	۱۹۶۲ء
۲۰۔ صبح نو	پٹنہ	ہمعصر اردو ادب نمبر	۱۹۷۷ء
۲۱۔ صبح نو	پٹنہ	ہمعصر اردو ادب نمبر	۱۹۶۲ء
۲۲۔ صنم	پٹنہ	اکتوبر	۱۹۶۱ء
۲۴۔ عصری آگہی	دہلی	مارچ	۱۹۸۰ء
۲۵۔ عصری آگہی	دہلی	جولائی، اکتوبر	۱۹۹۰ء
۲۶۔ کتاب نما	دہلی	جون	۱۹۸۳ء
۲۷۔ کتاب نما	دہلی	جولائی	۱۹۸۹ء

۲۸۔ کتاب نما	دہلی	مارچ	۲۰۰۱ء
۲۹۔ کتاب نما	دہلی	اپریل	۲۰۰۷ء
۳۰۔ کتاب نما	دہلی	فروری	۲۰۱۳ء

☆☆☆

اخبارات

اخبار	نوعیت	مقام
۱۔ انقلاب جدید	روزنامہ	پٹنہ
۲۔ انقلاب	روزنامہ	دہلی
۳۔ الجمیعت	ہفت روزہ	دہلی
۴۔ اخبار مشرق	روزنامہ	دہلی
۵۔ پرتاپ	روزنامہ	دہلی
۶۔ پیسہ	ہفتہ وار	پنجاب
۷۔ تیج	روزنامہ	دہلی
۸۔ جہان ہند	ہفت روزہ	دہلی
۹۔ دعوت	سہ روزہ	دہلی
۱۰۔ راشٹریہ سہارا	روزنامہ	نوئیڈا
۱۱۔ سیاست	روزنامہ	دہلی
۱۲۔ سیاست	روزنامہ	حیدرآباد

school of modern prose as he not only made a marvellous pattern but motivated a number of friends and followers like Hali, Zakaullah, Mohsinul Mulk etc.

This research work would dialogue the basics of his essays which was still untouched, the findings will definitely contribute a lot to the history of Urdu literature.

(6) <u>Research Methodology - to be adopted:</u>

As a first step of this research , all the essays of Sir Syed will be studies and a topics- wise list will be prepared.

In the next step, content and language of various essays will be assessed to know as if the topic has any role in expression and language.

There after, the common topics of other writings of Sir Syed will be searched out to compare them with the essays in respect of content and langauge.

Lastly, All the peculiar features and characteristics of the essays will be elaborated in findings of the work.

(7) Work Design:

Fore word

۱۹ویں صدی میں اردو نثر۔ایک طائرانہ نظر

Chapter I : Urdu Prose in 19th Century - a bird's eye view

سرسید کی ابتدائی اردو نثر (سفر انگلستان سے قبل)

Chapter II: Early Urdu Prose of Sir Syed (before his jouney to England.

مضامین سرسید۔موضوع ومواد

Chapter III: Essays of Sir Syed - Topics & Contents.

مضامین سرسید۔زبان اور اسلوب

Chapter IV: Essays of Sir Syed - Language & Style.

مضامین سرسید کا ان کی دوسری تحریروں سے موازنہ

Chapter V: Comparision of essays with other writings of Sir Syed.

Conclusion — حاصل مطالعہ

Bibliograpy — کتابیات

نگراں Approved. [signature] 20.06.12 — مقالہ نگار

(Supervisor) — Farhat Bano 15.06.12 Researcher)

Contents and Language of Sir Syed's Essays - A Study

Forwarded
20.05.16

Thesis Submited to

L.N.Mithila University

Darbhanga

For the degree of

Doctor of Philosophy

in Urdu

2016

Supervisor

Dr. Barkat Ali

MA (Double) Ph.D. (PU)

Associate Professor

& HoD Urdu

M.L.S.M. Cellege

Darbhanga

Farhat Bano

Researcher

Farhat Bano

Muraitha, Jale

Dist: Darbhanga

Bihar

SYNOPSIS FOR Ph.D. DEGREE IN URDU

(Faculty of Humanities)

Uncer L.N.M. University, Kameshwarnagar, Darbhanga

Name of Researcher : **FARHAT BANO**

Name of Supervisor : **Dr. Barkat Ali**

Associate Professor

H.O.D. Urdu

M.L.S.M. College, Darbhanga

(1) Title of the Research work:

مضامین سرسید کے موضوعات، مواد و زبان کا مطالعہ

Contents and languages of Sir Syed's Essays.

(2) Statement of Research of Problems:

The great urdu essayist, Sir Syed not only wrote a large number of essays is Urdu but started to express domestic, Social, Cultural, Political and Historical issues in a very simple and lucid language. Although, this type of language was introduced by the munshies of Fort William College and Ghalib also adopted the some pattern in his letters, the style of expression of Sir Syed in unique in Urdu. It seems that he, always keeps the common readers in his mind.

In this context, the analytical study of the topics, contents and language of the essays of Sir Syed will be meaningful in

understanding the issues which were prevailing during the last four decades of 19th century.

(3) Objective of the research work:

Generally, It is said by some writers that Sir Syed was a great essayist and he was a trend setter. But the feature, Elements and shades of his essays have not been analysed. Hence the main objective of the research works to focus this aspect of his essays. The comprehensive and intensive study of his essays will reflect the inside picture of Sir Syed's personality.

(4) Research Coverage-theme & Area:

This research work will cover all the writings specially the essays of Sir Syed as secondary sources, the opinions of writers as well as other dignitaries will also come under the purview of this work. So that the findings may be significant and for reaching.

(5) Contribution of research work to the discipline of Urdu langauge and literature:

In the history of Urdu literature, Sir Syed has become a

مضامین سر سید کے موضوعات، مواد اور زبان کا مطالعہ

Forwarded
20.5.16

تحقیقی مقالہ

برائے۔ پی ایچ۔ ڈی۔ ڈگری (اردو)
ایل۔ این۔ متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ

(3123)

2016

نگراں
ڈاکٹر برکت علی
ایسوسی ایٹ پروفیسر وصدر شعبۂ اُردو
ایم۔ ایل۔ ایس۔ ایم کالج، دربھنگہ

تحقیق کار
Farhat Bano
فرحت بانو
بنت عبد الرؤف
مریٹھا، جالے
ضلع: دربھنگہ، بہار

باب پنجم

مضامین سرسید کا دوسری تحریروں سے موازنہ

Comparision of Essays with other writtings of Sir Syed

مضامین سرسید کا دوسری تحریروں سے موازنہ

سرسید احمد خاں کثیرالجہات مصنف تھے۔ ان کے کارناموں کی لمبی فہرست ہے۔ انہوں نے اردو زبان وادب کو ترقی دے کر اس کے نشو ونما میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ انہوں نے اردو نثر کو اجتماعی مقاصد سے روشناس کیا اور اسے سادہ سلیس اور عام فہم بنا کر عام اجتماعی زندگی کا ترجمان بنایا۔ ان کے دور میں عام طور پر طرز بیان کو اہمیت دی جاتی تھی۔ انہوں نے مضمون کو اولیت دی۔ اس وقت نثر میں تکلف اور تصنع بھرا ہوا تھا، سرسید احمد نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔

سرسید احمد خاں نہایت اثر پذیر شخص تھے۔ وہ جس ماحول میں رہے اس کا اثر قبول کیا۔ ان کے اندر وقت کے ساتھ ساتھ بدل جانے کی بڑی صلاحیت تھی یہی وجہ ہے کہ ان کی تصانیف ارتقا اور تغیر کا عجیب وغریب نقشہ پیش کرتی ہیں۔ ان کی ابتدائی زندگی پر خاندانی روایات کا اثر تھا اس کے بعد انگریزی ملازمت کے دوران نئی فضاؤں سے آگاہ ہوتے رہے۔ اس دور میں وہ پرانی ڈگر سے ہٹ کر یوروپ کے لوگوں کے نقش قدم پر چلنے

کی کوششیں کیں۔ پہلی جنگ آزادی (غدر) کے بعد ان کا ذہن زندگی کے جدید تر مسائل سے دوچار ہوتا رہا۔ سفر انگلستان کے بعد ان پر مغربی خیالات ورجحانات کا جو رنگ چڑھا وہ ساری زندگی ان کے ساتھ رہا۔ سید عبداللہ فرماتے ہیں:

''ان کی زندگی کا ابتدائی دور قدیم خاندانی روایات کے اثر میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد انگریزی ملازمت کے زیر اثر وہ نئی ہواؤں اور نئی فضاؤں سے روشناس ہوتے ہیں۔ اس میں وہ پرانی ڈگر سے ہٹ کر مستشرقین یوروپ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے بعد زمانۂ غدر کے مسائل ومباحث سامنے آتے ہیں اور ان میں ان کا ذہن زندگی کے جدید تر اور عجیب تر مسائل سے دوچار ہوتا ہے۔''

(سر سید اور ان کے نامور رفقا، سید عبداللہ، ص: ۱۴)

مضامین سر سید ان کی دوسری تحریروں سے موازنہ کرنے کے لئے ان کی تصنیفی زندگی کو کئی خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جیسے مذہبی، تاریخی، سیاسی، اور اصلاحی۔

سر سید احمد کی مذہبی فکر میں سب سے زیادہ اہم پہلو مغربی تہذیب اور عیسائی

مذہبی تحریک ہے۔ دار اصل وہ مختلف فیہ مذہبی مسائل میں پڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن اس وقت معاشرے میں مذہب کے بغیر کوئی گفتگو مکمل نہ تھی اس لیے انہیں بھی کبھی کبھی اپنے معتقدات کا اظہار کرنا پڑا۔ ابتدا میں انہوں نے اپنے دینی تصورات کو رسائل کے ذریعہ عام کرنے کی کوشش کی اور اس جدید رجحان کی روشنی میں قرآن مجید کی نئی تفسیر پیش کی۔

سرسید احمد خاں نے مذہب سے متعلق تمام تحریروں کو ''تصانیف احمدیہ'' کی نو جلدوں میں یکجا کر دیا ہے اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

''اس میں متعدد مذہبی کتابوں کے لکھنے کا اتفاق ہوا جو ہر ایک وقت کے خیالات کے مطابق ہیں ان سب کا بترتیب جمع کرنا گویا ان تمام زبانوں کے خیالات کو بہ ترتیب سامنے رکھنا ہے جس سے شاید مجھ کو اور آئیندہ آنے والی نسلوں کو فائدہ ہو پس میں اپنی تصنیفات کے اس حصہ میں مذہبی کتابوں اور رسالوں کو ایک جگہ جمع کرتا ہوں۔ گو مجھ کو علمی لیاقت کچھ نہیں اور میرا درجہ ایک جاہل آدمی سے شاید ہی کچھ زیادہ ہو لیکن اللے پن سے سوچنے والی طبیعت تھی۔ جب حیوانی زندگی سے طبیعت نے

دوسری طرف پلٹا کھایا تو اس کی کروٹ بجز مذہبی کروٹ کے

اور کیا ہو سکتی تھی۔ اور وہ پہلو بجز اس پہلو کے جو علم تھا اور جس پر

سب کا یقین تھا اور کیا ہو سکتا تھا۔"

(تمہید تفسیر القرآن، سرسید احمد مشمولہ سرسید اور ان کا عہد مرتبہ ثریا حسین، ص:۵۹)

سرسید احمد نے ۱۸۴۲ء میں ایک مختصر رسالہ "جلاء القلوب بذاکر المحبوب"

لکھا۔ اس رسالہ میں انہوں نے رسالت مآب سے متعلق ضروری معلومات لوگوں تک

پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے دور میں محفل میلاد کی محفلیں کثرت سے آراستہ کی جاتی

تھیں۔ اس وقت جو مولود نامے موجود تھے انہیں لوگ بڑی عقیدت سے پڑھتے تھے۔

انہوں نے پیغمبر اسلام "رسول اکرم ﷺ کے مختلف نام، شکل وصورت، وضع قطع اور سیرت

کے ساتھ ساتھ آپ کے صحابہ کا پالتو جانور، نجی ہتھیار، آپ کے معجزے اور آپ کے حجتہ

الوداع کا تذکرہ کیا ہے۔

تحفۂ حسن: "تحفۂ اثنا عشریہ" مولانا شاہ عبدالعزیز کے رسالہ سے متاثر ہو کر سید احمد خاں

نے اس کے دسویں اور بارہویں باب کا اردو میں ترجمہ "تحفۂ حسن" کے نام سے کیا۔ اس

کی تیاری میں انہوں نے اپنے استاد مولانا نور الحسن دہلوی سے مدد لی تھی جس کا اعتراف

انہوں نے خود کیا ہے۔ یہ پہلی بار ۱۸۴۲ء میں چھپا تھا۔

کلمۃ الحق:۔ اس میں پیری مریدی سے بحث کی گئی ہے اور خانقاہی رسم و رواج پر اعتراض کیا گیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ دین حضورﷺ کی حیات میں ہر اعتبار سے مکمل ہوگیا تھا اس لئے اب اسمیں کسی قسم کا اضافہ غلط ہے۔

سولہ صفحات پر مشتمل اس رسالہ میں سرسید احمد خاں نے سنت کی تائید اور بدعت کی مخالفت کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ خدا کی اطاعت اور رسول کریم کی سنت کی پیروی کے علاوہ نجات کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

سرسید خاں نے امام غزالی کی کتاب کیمائے سعادت کے کچھ حصوں کا ترجمہ ''دیباچہ کیمیائے سعادت'' کے نام سے کیا۔ اس کتاب میں زور دیا گیا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے، اسے اپنی جسمانی اور روحانی تربیت اس طرح کرنی چاہئے کہ اسے رضائے الٰہی اور خوشنودی رب حاصل ہو جائے۔ پہلی بار یہ ۱۸۵۲ء میں شائع ہوا تھا۔

سرسید احمد خاں نے ''رسالہ احکام طعام اہل کتاب'' لکھ کر اپنی رائے لوگوں کے پاس پیش کی کہ قرآن مجید اجازت دیتا ہے کہ اہل کتاب کے یہاں کا ذبیحہ گوشت مسلمان کھا سکتے ہیں۔ دوسری بات انہوں نے یہ کہی ہے کہ انہیں کھانے کی دعوت دینا اور

ان کے کھانے کی دعوت کو قبول کرنا اسلامی نقطۂ نظر سے درست ہے۔

تبیینہ الکلام:۔اس کتاب میں سرسید احمد خاں نے انجیل کا تحقیقی مطالعہ کیا ہے۔دوسرے مذاہب کی دینی کتابوں کا بغور مشاہدہ اور تجزیہ کرنا ایک بڑی بات کہی جاسکتی ہے۔انہوں نے اردو میں تقابلی مطالعہ کی بنیاد ڈالی۔

اس کتاب میں اردو متن کے ساتھ انگریزی ترجمہ بھی شامل ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ انگریزی میں بھی اسلام کی اشاعت کی جائے اور ہندوستانیوں کو دونوں مذاہب کے مشترک اصولوں سے واقف کردیا جائے۔

الخطبات الاحمدیہ:۔ ۵۲۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں بارہ مقالے ہیں۔اس کتاب کے لکھنے میں جو پریشانیاں اور دشواریاں پیش آئیں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ تقریباً سوا سال تک انگلستان کے اہم کتب خانوں، کتب فروشوں کی دکانوں اور مستشرقین سے استفادہ کیا۔اپنے دوستوں اور عالموں سے مطلوبہ معلومات فراہم کیں۔ جس کتاب کے لکھنے کا ارادہ انہوں نے کیا تھا اس کے لئے نہ صرف انگریزی اور عربی جاننا ضروری تھا بلکہ یونان، لاطینی، عبرانی اور جرمن و فرانسیسی بھی۔ وہ نہ صرف غلط اعتراضوں کی تردید کرنا چاہتے تھے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کو تقابل سے

اسلام کی طرف راجع کرنا چاہتے تھے۔ اس کتاب کی فہرست اس طرح ہے:

اس طرح سرسید احمد خاں کی کتاب ''الخطبات احمدیہ'' کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ اسلام پر مستحکم ایمان رکھتے تھے۔ان کی کتاب ''تفسیر القرآن'' سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں قرآن مجید کو کتنا اہم اور بنیادی مقام حاصل ہے۔ان کی تفسیر سات جلدوں میں ہے۔

جو لوگ ان کے مذہبی عقائد پر اعتراض کرتے تھے ان کا فرداً فرداً جواب وہ نہیں دے سکتے تھے اس لئے انہوں نے قرآن مجید کی تفسیر لکھ کر اپنے نظریات کی وضاحت کردی۔اس سلسلے میں ثریا حسین لکھتے ہیں:

> ''یوں تو سید احمد خاں اپنی متعدد تصانیف میں اسلام کے بیشتر مسائل سے متعلق اپنی آراء کا اظہار کر چکے تھے، مثلاً غلامی، تعداد ازدواج، وحی کی ماہیت، فرشتہ، شیطان اور معجزہ۔ جو لوگ ان کے خیالات پر اعتراض کرتے تھے وہ سب دلیل کے طور پر قرآن کی آیتوں کو نقل کر کے ان کو اپنے نظریہ کے مطابق معنی دیتے تھے چونکہ وہ ہر معترض کا جواب فرداً فرداً نہیں دے سکتے تھے۔اس لئے انہوں نے یہ مناسب سمجھا کہ وہ خود قرآن پاک

کی ایک ایسی تفسیر لکھیں جس میں وہ اپنے نظریات کی بخوبی
وضاحت کرسکیں۔انہیں کچھ ایسے علماء اور فضلا کی علمی استعانت
حاصل تھی جن پر وہ کلی اعتماد کر سکتے تھے۔''

(سرسید احمد اور ان کا عہد، ثریا حسین، ص:۱۳۱)

مذہبی موضوعات پر ان کے کئی مضامین ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' میں شائع ہوئے۔ڈاکٹر ڈبلو ڈبلو ہنٹر نے ۱۸۷۱ء میں ایک کتاب ''ہمارے ہندوستانی مسلمان' لکھی تھی۔اس میں انہوں نے لکھا تھا کہ برطانوی حکومت کو مسلمانوں پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اسلام مسلمانوں کو غیر مسلموں کے خلاف جہاد کی تعلیم دیتا ہے۔اس کتاب سے ہندوستانی مسلمانوں کی حالت خراب ہونے کا ڈر تھا۔اس طرح کے کئی دوسرے الزامات بھی مسلمانوں پر لگائے جارہے تھے۔سرسید احمد خاں نے انکے الزامات کا مدلل جواب دینے کے لیے مضامین کا یہ سلسلہ شروع کیا تھا۔''ہندوستانی مسلمان'' کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان بھی انگریزی حکومت کے اتنے ہی وفادار ہیں جتنے ہندوستان کے دوسرے لوگ۔سرسید احمد نے انگریزوں کو بتایا کہ یہ بات بالکل غلط ہے کہ اسلام عام حالات میں غیر مسلموں کے خلاف جہاد کی تعلیم دیتا ہے۔انہوں نے ڈاکٹر ہنٹر کے اس

الزام کی تردید کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ اسلام بلاوجہ حکومت وقت سے جہاد یا فوجی بغاوت پر آمادہ نہیں کرتا بلکہ صلح و دوستی کا سبق اور مل جل کر رہنے کی ترغیب دیتا ہے۔

مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے اور ان اعتراضات کا جواب دینے کے لئے جو دیگر مذاہب والے آنحضرتؐ کی ذات پر کر رہے تھے، سرسید احمد نے اس طرح کے مضامین لکھ کر ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' میں شائع کروائے۔

سرسید احمد خاں کو دیگر مصلحین کی طرح اپنی زندگی میں مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کسی کو ان سے ذاتی اختلاف نہ تھا بلکہ زیادہ تر اختلافات ان کے مذہبی معتقدات سے تھا۔ ان کے دور میں عام طور پر اسلام کی جو تفسیر پیش کی جاتی تھی وہ اسے تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ مسلمان اس اسلام کی تعلیمات پر عمل کریں جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے نزدیک مستند نہیں۔

تعلیمات اور اعمال کی درستی اور صحت پر سرسید احمد کی ضد نے ان کے خلاف ایک بڑا طوفان کھڑا کر دیا۔ انہیں کافر اور اسلام دشمن تک کہا گیا لیکن بعد میں ان کے اصلاحی خیالات سے چاہے وہ معاشرے سے متعلق ہوں یا مذہب سے، بہت سے لوگوں نے تائید کی اور ان کے وفات کے بعد تو ان کے موافقین کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی۔

تاریخ نویس کے لحاظ سے سر سید احمد کا کارنامہ بے حد اہم ہے۔ انہوں نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز تاریخ نویسی سے کیا تھا۔ ان کی اس طرح کی تحریر میں تنگ نظری اور تعصب کا نام ونشان نہیں ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اپنی قوم کی تاریخ کو بھول جانے سے زیادہ بے عزتی قوم کے لئے کیا ہوسکتی ہے۔

سر سید احمد خاں نے ''جام جم''، ''آثار الصنادید''، ''سلسلۃ الملوک''، ''تصحیح آئینۂ اکبری''، ''تصحیح تاریخ فیروز شاہی''، تصحیح توزک جہانگیری وغیرہ جیسی اہم تاریخی کتابیں لکھیں۔

''جام جم'' میں تیمور بانی خاندان سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک ۴۳ فرماں رواؤں کے حالات تاریخی ترتیب کے ساتھ درج ہیں۔

''آثار الصنادید'' سر سید احمد خاں کی ایک ایسی تاریخی کتاب ہے جس کی آج تک مثال نہیں ملتی۔ اس کتاب کے ذریعہ انہوں نے سلطنتوں کے عروج وزوال کا جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ تاریخ کے بہت سے مخفی پہلو سامنے آئے۔ آگرہ اور دہلی کے کھنڈروں نے ان کے ذوق تاریخ کو نمایاں کیا۔ انہوں نے خود لکھا ہے:

''اگر چہ لوگ یہ خیال ظاہر کریں گے کہ میں نے جو اس شہر کے

لوگوں کا حال لکھا ہے وہ بہ نظر حب الوطن ہوگا لیکن جن لوگوں
کے مزاج میں انصاف ہے وہ میری اس ساری کتاب کو دیکھ کر
جان لیں گے کہ میں نے جو حال لکھا ہے وہ افراط اور تفریط سے
خالی ہے۔ حقیقت میں یہاں کے لوگ ایسے ہیں کہ شاید اور کسی
اقلیم کے نہ ہوں گے۔ ہر ایک شخص ہزار ہزار خوبی کا مجموعہ اور
لاکھ لاکھ ہنروں کا گلدستہ ہے ہر ایک کو علم و ہنر سے شوق اور دن
رات لکھنے پڑھنے ہی سے ذوق ہے۔''

اس کے بعد ایک سوسترہ معاصر مشاہیر کا بیان ہے جن کے متعلق مصنف نے اعتراف کیا کہ:

''اب میں تھوڑا سا بزرگان معاصرین علیہ الرحمہ کا جن کی فیض
خدمت میں مشرف ہوا ہوں یا اس زمانے میں ان کے وجود
سے عالم کو رونق تھی حال لکھتا ہوں۔''

(آثار الصنادید، سر سید احمد خاں، ص: ۱۴، ۱۵)

پہلے ایڈیشن میں جو کمی رہ گئی تھی اسے سر سید احمد نے دوسرے ایڈیشن میں پورا

کیا۔انہیں تاریخ اور ثقافت سے ایسا لگاؤ تھا کہ خطرات مول لے کر اونچی اونچی عمارات پر لکھے ہوئے قدیم رسم الخط کے کتبے پڑھے اور بڑی مشکل سے اس کے چربے اتارے پھر تحقیق بھی کی کہ کون سی عمارت کس بادشاہ نے بنوائی۔

''سلسلۃ الملوک'' میں دلی کے دو سو بادشاہوں کا سلسلہ راجہ یدھسٹر سے شروع ہو کر ۱۸۵۲ء تک پھیلا ہوا ہے۔اس کتاب میں مغلوں کا تذکرہ بھی ضمنی طور پر کیا گیا ہے۔

سرسید احمد خاں نے بڑی مہم جوئی اور کاوش کے بعد ''آئینہ اکبری'' کا صحیح تر نسخہ ''تصحیح آئینۂ اکبری'' کے نام سے کیا ہے۔اصل ''آئینہ اکبری'' میں بہت سی غلطیاں تھیں انہیں سرسید احمد نے پر کیا اور تصویروں سے مزین کیا۔

''صحیح تاریخ فیروز شاہی'' لکھنے کے لیے بنگال رائل ایشاٹک سوسائٹی نے سرسید احمد سے فرمائش کی تھی۔ چنانچہ سرسید احمد نے ''تاریخ فیروز شاہی'' کا اصل نسخہ دہلی کتب خانے سے حاصل کیا اور ایک مستند نسخہ بڑے سائز کا باسٹھ صفحات پر مشتمل ''صحیح تاریخ فیروز شاہی'' کے نام سے شائع کروایا۔

''تصحیح تو زک جہانگیری'' سرسید احمد کی ایک اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔

''توزک جہانگیری'' کے نام سے جہانگیر نے کتاب کا آغاز اپنی تخت نشینی سے کیا تھا اور اس میں اول سال جلوس سے سترہویں سال کے وسط تک احوال خود تحریر کئے بعد میں اس میں اضافے بھی کئے گئے تھے۔ سر سید احمد خاں نے مختلف نسخوں سے مقابلہ کرنے کے بعد مرزا ہادی کا دس صفحوں کا دیباچہ شامل کر کے ''تصحیح تاریخ فیروز شاہی'' کے نام سے شائع کروایا تھا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سر سید احمد خاں کو تاریخ نویسی کا کتنا شوق تھا۔ انہوں نے خود ہی ایک جگہ لکھا ہے:

> ''وہ قوم نہایت بدنصیب ہے جو اپنے بزرگوں کے ان کاموں کو جو یاد رکھنے کے قابل ہیں بھلادے یا ان سے بے خبر رہے۔ ہماری تاریخیں اس زمانے کی لکھی ہوئی ہیں جب تاریخ نویسی کے فن کو پوری طرح ترقی نہیں ملی تھی۔ اس لیے ہمارے بزرگوں کے کاموں کے گوہر آبدار کہیں بکھرے پڑے ہوئے ہیں اور کہیں کوڑے کرکٹ میں اسے ملے ہیں۔''

(المامون۔ شبلی نعمانی، دیباچہ از سر سید احمد خاں، ص: ۴)

مختصر یہ کہ سر سید احمد خاں نے اپنی تاریخ نویسی کے ذریعہ قدیم ہندوستان اور

قرون وسطی کے تہذیبی اور آساری سرمائے میں یکساں طور پر دلچسپی لے کر ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔

سرسید نے باقاعدہ سیاست پر کوئی علمی بحث نہیں کی ہے بلکہ ان کے سیاسی خیالات ان کے عہد کی دین تھے۔ انیسویں صدی کے ہندوستان میں سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور تعلیمی مسائل ایک دوسرے میں اس طرح پیوست تھے کہ ان میں ربط وتوازن پیدا کئے بغیر کوئی تحریک کامیاب نہیں ہوسکتی تھی۔ سرسید احمد خاں ایک ایسے قومی رہنما تھے جنہوں نے اجتماعی زندگی کے ہر پہلو پر غور کیا۔ انہیں دہلی کی سورش کی خبریں ملتی رہیں۔ ان کے خاندان کے لوگ وہیں تھے۔ وہ اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر بجنور سے میرٹھ پہنچے اور وہاں پانچ ماہ رکنے کے بعد پریشانی کی حالت میں دہلی آئے۔ جب دہلی پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ خاندان کے کچھ لوگ اور ایک عزیز دوست فرنگیوں کے ظلم کا نشانہ بن چکے ہیں۔ ان کی والدہ اور خالہ تین دن کی بھوکی پیاسی نوکر کی کوٹھری میں چھپی بیٹھی تھی۔ انہیں بڑی مشکل سے میرٹھ لائے جہاں ان کا ۱۸۵۷ء ہی میں انتقال ہو گیا۔ ان لرزہ خیز واقعات کا انہوں نے گہرا اثر قبول کیا۔ انہوں نے اپنے کرب کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''غدر کے بعد مجھ کو نہ اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا اور نہ مال واسباب

کے تلف ہونے کا جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی اور

ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گذرا اس کا رنج

تھا۔ جب ہمارے دوست مرحوم شیکسپیر جن کی مصیبتوں میں ہم

اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک تھے بعد میں اس وفاداری

کے صلہ میں جہاں آباد جو سادات کا ایک نہایت نامی خاندان

کی ملکیت تھا اور لاکھ روپے سے زیادہ کی مالیت کا تھا مجھ کو دینا

چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں

کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو

بربادی ہو اور میں ان کی جائداد لے کر تعلقدار بنوں۔ میں نے

اس کے لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں

رہنے کا نہیں ہے۔''

(سرسید احمد خاں کے لکچروں کا مجموعہ بحوالہ سرسید احمد خاں اور ان کا

عہد، ص:۳۰۰)

جب حالات کچھ بہتر ہوئے تو ۱۸۵۷ء ہی میں بحیثیت صدر الصدور مراد آباد

گئے۔ وہاں کی حالت دیکھ کر وہ بے حد پریشان ہوئے اور وہیں رہ کر قوم کی اصلاح کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اپنے وطن میں رہ کر انہوں نے مسلمانان ہند کے لیے دو تدبیریں اختیار کیں۔ پہلی یہ کہ ہندوستانیوں میں مغربی تعلیم کو فروغ دینا تاکہ ان کی زبوں حالی اور پسماندگی جاتی رہے۔ اس مقصد سے انہوں نے مرادآباد میں ایک مدرسہ کھولا۔ غازی پور کا اسکول ہی اس سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ دوسرا یہ کہ ایسے رسالے لکھنا جس سے انگریزوں کی غلط فہمیاں دور ہوجائیں جو ہندوستانیوں کی طرف سے پیدا ہوگئی تھیں۔ اس تعلق سے انہوں نے تین کتابیں لکھیں:

(۱) سرکشی ضلع بجنور

(۲) اسباب بغاوت ہند

(۳) لائل محمڈنز آف انڈیا

''سرکشی ضلع بجنور'' میں سرسید احمد نے مسلمانوں کے مسائل کو غدر کے پس منظر میں دیکھا اور ایسا لائحہ عمل پیش کیا جو ان کی ترقی کا باعث بنا۔ اس کتاب سے سرسید احمد کا سیاسی موقف منظر عام پر آیا۔ انہوں نے کتاب کے آخر میں اپنی قوم کے لوگوں کو باخبر رہنے، زمانہ کے ساتھ چلنے اور آنے والی زندگی کے بارے میں معروضی انداز سے سوچنے

کی دعوت دی۔ اس کتاب سے انگریزوں کے سنجیدہ حکام نے اپنی پالیسیوں میں نظر ثانی کرنے پر بھی آمادگی ظاہر کی۔

''رسالہ اسباب بغاوت ہند'' لکھ کر سر سید احمد نے انگریزوں کو غدر کی صحیح صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ جانتے تھے کہ انگریزوں کو اس بغاوت کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ اس لیے انہوں نے صحیح صورت حال سے انہیں آگاہ کیا جس کی وجہ سے سر سید احمد کی پیش کردہ بہت سی تجاویز پر عمل درآمد ہوا۔

''لائل محمڈنز آف انڈیا'' سر سید احمد نے انگریزوں سے باہمی منافرت کی خلیج کو پاٹنے اور مسلمانوں پر عائد کردہ الزامات کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے یہ ششماہی رسالہ جاری کیا تھا۔ اس رسالہ میں بائیس ایسے خیر خواہوں کے نام اور حالات درج ہیں جنہوں نے اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر حکومت سے وفاداری کی۔ دوسری بات یہ بتائی کہ غدر کی کوئی مذہبی حیثیت نہ تھی اس لیے اس پر جہاد کا اطلاق نہیں ہوتا۔

اس طرح سر سید احمد نے ان تینوں کتابوں کے ذریعہ اپنی سیاسی بصیرت کا وہ ثبوت پیش کیا ہے جو اس وقت دوسرے کوئی ہندوستانی پیش نہ کر سکے۔ سر سید احمد کی سیاسی تحریریں مدافعانہ ہیں۔ انہوں نے ان کے ذریعہ یہ ثابت کیا کہ ہندوستانی باغیانہ

سرگرمیوں میں شامل نہیں تھے بلکہ یہ سب حالات کا تقاضا تھا۔ انگریز حکمراں ہی اس کے ذمہ دار تھے۔

سر سید احمد خاں کے بغاوت کے محرکات کو ثریا حسین نے اس طرح پیش کیا ہے:

''سید احمد خاں کے نزدیک بغاوت کے خاص خاص محرکات میں ہندوستانیوں کی اعلیٰ مراتب میں عدم شمولیت، ان کے رسم ورواج اور مذاق کے خلاف قوانین کی تشکیل اور حکومت برطانیہ کی ان کے حالات و جذبات سے ناواقفیت تھی۔ ''رسالہ اسباب بغاوت ہند'' میں مصنف کی پیش کردہ بہت سی تجاویز پر عمل درآمد ہوا۔ مثلاً سید احمد خاں کی تجویز پر ۱۸۶۱ء میں ہندوستانیوں کو قانون ساز مجلس (کاؤنسل) کا ممبر منتخب کیا گیا اور ۱۸۶۲ء کے اجلاس کاؤنسل میں پہلی بار مہاراجہ نریندر دیو (پٹیالہ) راجہ دیونراین سنگھ رئیس بنارس اور راجہ دنکر راؤ دیوان ریاست گوالیار بحیثیت رکن شریک ہوئے۔ اس کے علاوہ

انہوں نے ہندوستانیوں کو اعلیٰ عہدے نہ ملنے کی بھی شکایت کی تھی تو ۱۸۶۲ء میں پہلی بار شمبھو ناتھ ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔''

(سرسید احمد خاں اور ان کا عہد، ثریا حسین ص:۳۰۴)

سرسید احمد خاں نے نہ صرف صحافت میں قدم جما کر اپنی اہمیت کا احساس دلایا ہے بلکہ اس کے ذریعہ قوم کی اصلاح کی ہے۔ انہیں روشن دنیا سے روشناس کرایا ہے۔ ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' اور ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعہ انہوں نے اردو صحافت کو بلندی پر پہنچایا۔ اول الذکر میں انگریزوں کے چند اہم اخباروں کی خبروں اور مضامین کے ترجمے شائع ہوتے تھے۔ حالات حاضرہ پر بے باک تبصرے کئے جاتے تھے۔ اس گزٹ میں تعلیم، تاریخ، سیاست، مذہب، ادب، سائنس اور دوسرے کئی اہم موضوعات پر طبع زاد اور ترجمہ شدہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ سرسید احمد خاں نے اخبار کو کیا ہونا چاہئے اور اس کا مقصد کیا ہونا چاہئے پر اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''اردو زبان کی بے بضاعتی اور مفلسی کے ذمہ دار بھی انگریزی

تعلیم یافتہ نوجوان ہیں.....انگریزی تعلیم یافتہ بنگالیوں نے اپنی

زبان کو یورپ کی زبانوں کے ذخیرے سے مالا مال کردیا۔

پروفیسر شبلی نے اس خیال کے مطابق ایک دردناک واقعہ اردو

زبان بولنے والے انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کی بے توجہی کا

بیان کیا اور خواہش ظاہر کی کہ یوروپین مصنفوں کے اعلیٰ

مقالات کا لفظی ترجمہ کر دیا جاوے جن میں ان کی مخصوص

خوبیاں پائی جاتی ہیں جو انگریزی جاننے والے اور ان خوبیوں

سے بہرہ اندوز ہونے اور ان سے اپنی اردو زبان کو بھر دینے کا

موقع ملے گا۔''

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ۔سرسید احمد خاں۔۴؍جولائی ۱۸۹۲ء ص:۶۵۴)

''تہذیب الاخلاق'' کے بارے میں پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ سرسید نے اس

رسالے کو قوم کی ذہنی تربیت کے لیے جاری کیا تھا۔ اس کے لئے انہوں نے خود بھی

مضامین لکھے اور دیگر اہل قلم کی تحریریں بھی شامل کی گئیں۔ مغربی دانشوروں کے انگریزی

مضامین کے اردو ترجمے بھی شائع کئے گئے۔

سرسید احمد کے خطوط کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے خطوط کے مطالعہ کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے مبالغہ آرائی، مقفیٰ و مسجع انداز بیاں کے بجائے اثر آفرینی کو ضروری سمجھا ہے۔ ان کے خطوں میں سادگی وسلاست جامعیت اور اختصار ہے۔ انہوں نے القاب وآداب کا کوئی خاص اہتمام نہیں کیا ہے۔ سادہ اور برمحل القاب کی وجہ سے ان کے یہاں یگانگت اور گرم جوشی پیدا ہوگئی ہے۔ ان کے خطوط میں ان کی شخصیت کے نمایاں اوصاف جیسے سادگی، معصومیت، مستقل مزاجی اور محنت و ایثار دیکھے جاسکتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

> ''سرسید کی ادبی تحریک اوران کے شخصی رنگ خط نگاری نے بھی خاص حد تک اردو خط وکتابت پر اثر ڈالا۔ سرسید جس طرح نثر میں مدعا اور مقصد کے داعی ہیں اسی طرح خط نگاری میں بھی مقصد ہی کے علمبردار ہیں۔ انہوں نے اپنے مضامین تہذیب الاخلاق میں خود اس کا ذکر کیا ہے کہ وہ صرف کام کی باتیں کہنا چاہتے تھے اور عبارت آرائی، تکلف اور اطناب بے مقصد سے احتراز کرتے ہیں۔ ان کے خط ان کی عام نثر کے مقابلہ میں

زیادہ شگفتہ ہیں.....بہر حال یہ مسلم ہے کہ سرسید نے اردو خطوط
نگاری کو مضمون کی قطعیت، زبان کی سادگی اور تخاطب کے
خلوص سے آشنا کیا۔"

(میر امن سے عبدالحق تک۔سید عبداللہ، چمن بک ڈپو دہلی، ص:۱۹۵)

سرسید احمد خاں کا "سفر نامہ پنجاب" بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔
انہوں نے ۲۲ جنوری ۱۸۸۴ء کو پنجاب کا سفر شروع کیا اور دوران سفر ملک کے تعلیمی
حالات کو درست کرنے کے لئے پر جوش تقریریں کیں اور مدرسۃ العلوم کے لئے چندہ جمع
کیا۔ یہ سفر نامہ قومی جدوجہد کی ایک مختصر روداد ہے۔جس کا مقصد تعلیمی مشن کو فروغ دینا
اور قوم کو مغربی تعلیم سے آراستہ کرنا تھا۔ دوران سفر سرسید احمد نے ہندو مسلمان اراکین،
آریہ سماج اور ہندو مہا سبھا نیز اسکول و کالج کے لڑکیوں سے ملاقاتیں کیں اور سب کا دل
اپنی دردمندی اور حق گوئی سے جیتا اور اپنا پیغام علم و عمل دوسری تک پہنچایا اور ان میں ایک
نئی تحریک پیدا کی۔

اب تک کے جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ سرسید احمد کے مضامین کے علاوہ
ان کی جو تحریریں سامنے آئی ہیں وہ مذہبی، تاریخی اور سیاسی نوعیت کی ہیں۔ان سے ہٹ کر

جب ہم سرسید احمد کے مضامین کا مطالعہ کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے سارے مضامین قوم کی اصلاح کے لئے لکھے۔ پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد پوری قوم تباہی کے دہانے پر کھڑی تھی۔ سرسید احمد نے اپنے مضامین کے ذریعہ انہیں صحیح راستے پر لانے کی کوشش کی۔ انہوں نے قوم کی جہالت، کاہلی، ریاکاری اور تقلید پرستی کو دیکھتے ہوئے ان موضوعات پر مضامین لکھے تاکہ قوم انہیں پڑھ کر اپنی اصلاح کر سکے۔ مسلمانوں کے اندر تعصب اور غلط رسم ورواج پوری طرح گھر کر چکے تھے۔ ان کا اخلاق پوری طرح گر چکا تھا۔ سرسید احمد نے اپنے مضامین کے ذریعہ اپنی قوم کو سمجھانے کی کوشش کی:

> ’’جس شخص میں اخلاق ہے اور اعتقاد نہیں وہ شخص بہ نسبت اس شخص کے جس میں اعتقاد ہے اور اخلاق نہیں، انسان کے لیے دنیا میں بہت زیادہ بہتری کرسکتا ہے اور میں اس قدر اور زیادہ کہتا ہوں کہ انسان کے لیے دین اور دنیا دونوں میں بھلائی کرسکتا ہے۔‘‘
>
> (اخلاق۔ مشمولہ انتخاب مضامین سرسید، ص:٦١)

سرسید احمد نے معاشرتی اصلاح کے لئے کئی مضامین لکھے۔ انہوں نے اپنی

قوم کو بتایا کہ وہ اپنے دماغ میں لغو خیالات کو نہ لائیں جن کی وجہ سے بہت سے لوگوں کی عقل اور سمجھ ماند پڑگئی ہے۔

سرسید احمد نے سب سے زیادہ زور مسلمانوں کی تعلیم پر دیا۔ انہوں نے اس سلسلے میں کئی مضامین لکھے جیسے ''تعلیم''، ''قدیم تعلیم''، ''تعلیم نسواں'' وغیرہ۔ اس وقت پوری قوم جہالت کے اندھیرے میں ڈوبتی جارہی تھی۔ سرسید احمد نے انہیں بتایا کہ تعلیم کے بغیر دنیا کی کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی۔ انہوں نے کہا کہ آج دنیا کی جو قومیں ترقی یافتہ ہیں سب نے تعلیم حاصل کی ہے۔ بغیر تعلیم حاصل کئے کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی اور نہ اپنا اونچا مقام حاصل کرسکتی ہے۔ انہوں نے تعلیم کے تعلق سے ایک بات یہ بھی کہی کہ جس ملک کی جو زبان ہوتی ہے اس زبان کو سیکھنا اور اس میں مہارت حاصل کرنا ضروری ہے کیونکہ کسی قوم کی یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

مسلمان انگریزی تعلیم سے ناواقف تھے اور اسے عیسائیوں کی زبان قرار دے کر اس کے قریب جانا نہیں چاہتے تھے۔ یعنی انگریزی زبان پڑھنے اور لکھنے کو وہ اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ سرسید احمد نے ان کے دل سے اس بات کو اپنے مضامین کے ذریعہ نکالنے کی کوشش کی۔ لکھتے ہیں:

''ہم نے اپنے دل کواور اپنے اندرونی قویٰ کو بالکل خراب کر دیا ہے۔علم جو حاصل کرتے ہیں وہ بھی بعوض اس کے کہ روحانی قویٰ کو شگفتہ و شاداب کرے ان کو پژمردہ کر دیتا ہے اور ہمارے قویٰ کو جو درحقیقت سرچشمے تمام نیکیوں کے ہیں بالکل کمزور اور ناکارہ کر دیتا ہے اور ہماری حالت تمام معاملات میں کیا دین کے اور کیا دنیا کے خراب ہوتی چلی جاتی ہے پس ہم کو اپنے پر رحم کرنا چاہئے اور ایسی تعلیم کو اختیار کرنا چاہئے جو اندرونی قویٰ کو شگفتہ وشاداب کرے اور دل کے سوتوں کو کھول کر سرجی چشمہ سے پانی باہر نکالے جس سے ہماری زندگی سرسبز وشاداب ہو۔''

(تعلیم وتربیت ۔سرسید احمد، مشمولہ انتخاب مضامین سرسید، مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور، ص:۵۶)

سرسید احمد چاہتے تھے کہ مشرق کی ہر عمدہ چیز کی قدر کی جائے ۔مشرقی تہذیب وتمدن کی قدر کی جائے۔ مگر مغرب سے بھی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے اور

انگریزی زبان سیکھنی چاہئے۔فرماتے ہیں:

''مسلمانوں کو بھی یہ لازم ہے کہ عربی زبان کی تحصیل نہ چھوڑیں یہ ہمارے باپ دادا کی مقدس زبان ہے۔ وہ فصاحت و بلاغت میں سمٹک زبان لاثانی ہے۔اس زبان میں ہمارے مذہب کی ہدایتیں ہیں لیکن جیسا کہ ہماری معاشی، ہماری بہتری، ہماری زندگی بہ آرام بسر کرنے کے ذریعہ بلکہ ہمارے اس زمانے کے موافق انسان بنانے کے وسائل انگریزی زبان سیکھنے میں ہیں تو ہم کو اس طرف بہت توجہ کرنی چاہئے۔''

(بحوالہ سرسید احمد خاں اور ان کا عہد، ثریا حسین، ص:۳۱۲،۳۱۳)

سرسید احمد تعلیم کو روزی روٹی سے جوڑنا چاہتے تھے۔دراصل ان کے زمانے میں مسلمانوں کا زوال انتہا کو پہنچ چکا تھا۔پہلی جنگ آزادی کے بعد مسلمان ہی انگریزی حکمرانوں کے غیض وغضب کے شکار ہوئے تھے۔انگریزی حکومت مسلمانوں کی طرف سے اتنی بدگمان ہوگئی تھی کہ وہ انہیں اپنا دشمن سمجھنے لگی تھی۔ان کی زمینداری، جاگیرداری اور

بڑے عہدے چھین لیے گئے تھے۔ سر سید احمد ان باتوں سے بہت دکھی تھے۔ وہ اپنی قوم کا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنے مضامین کے ذریعہ ان کے اندر ایک نئی روشنی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کے مضامین کے موضوعات مسلمانوں کی تباہی، ان کی جہالت، ان کے گمراہ کن عقائد، اندھی عقیدت اور غلط رسم و رواج، آپسی نفاق، ظاہر داری، مذہبی عقائد، خواتین کی تعلیم اور ان کی بہتری اور دنیا سے بے تعلقی کے نقصانات وغیرہ ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے سر سید احمد کے مضامین بہت اہم ہیں۔ انہوں نے اپنے مضامین کے ذریعہ اپنے قوم کی اصلاح کرنے کی کوشش کی۔ ابتدا میں وہ مذہب، تاریخ اور سیاست پر اپنی ساری توجہ مرکوز کئے ہوئے تھے لیکن غدر کے بعد انہوں نے اپنے مضامین کے ذریعہ اپنی قوم کو اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔

جب ہم سر سید احمد کے مضامین میں پائے جانے والے زبان و اسلوب سے ان کی دوسری تحریروں کا موازنہ کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ ان کی دوسری تحریروں کی ابتدائی نثر پرانے رنگ کی ہے اور اس کے بعد والی تحریروں میں مغربی طرز زندگی اور جدید خیالات کا تھوڑا بہت اثر دکھائی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی دوسری تحریروں میں مناظرہ، تقابل، مذاہب وغیرہ کا رنگ زیادہ گہرا ہے۔ دراصل ان کی ابتدائی تحریروں میں ان کا نظریہ خالص

علمی اور دینی تھا۔ ابتدا میں آثار قدیمہ سے بھی ان کی خاصی دلچسپی تھی۔ اس دور میں انہوں نے قدیم موضوعات کو نئے طرز بیان سے روشناس کرایا۔ لیکن مضامین کے ذریعہ وہ پرتکلف فارسی اسالیب سے اردو نثر کو آزاد کرانے کی کوشش کرنے لگے اور اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ انہوں نے اردو نثر کو اپنے مضامین کے ذریعہ اپنی زندگی ہی کا نہیں بلکہ پورے معاشرہ کا ترجمان بنایا۔ ان کے مضامین میں ان کی دوسری تحریروں سے زیادہ سادگی اور سلاست ہے۔ کہیں کہیں تو افسانوی رنگ ابھر آیا ہے۔ ''گزرا ہوا زمانہ''، ''امید کی خوشی''، ''بحث و تکرار'' اور ''سراب حیات'' وغیرہ میں اس رنگ کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔

> ''پھر وہ اپنی جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا۔ اپنا سرخ سفید چہرہ، سڈول بھرا بھرا بدن، رسیلی آنکھیں، موتی کی لڑی سے دانت، امنگ میں بھرا ہوا دل، جذبات انسانی کے جوش کی خوشی اسے یاد آتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ زمانہ میں ماں باپ جو نصیحت کرتے تھے اور نیکی اور خدا پرستی کی بات بتاتے تھے اور یہ کہتا تھا ''آہ ابھی بہت وقت ہے''۔ اور بڑھاپا

آنے کا کبھی خیال بھی نہیں کرتا تھا۔ اس کو یاد آتا تھا اور افسوس

کرتا تھا کہ کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی میں اس وقت کا خیال کرتا

اور خدا پرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا اور موت کے لئے

تیار رہتا۔ آہ وقت گذر گیا۔ آہ وقت گذر گیا۔ اب پچھتائے کیا

ہوتا ہے۔ افسوس میں نے آپ اپنے تئیں ہمیشہ یہ کہہ کر برباد کیا

کہ ابھی وقت بہت ہے۔"

(گزرا ہوا زمانہ، سرسید احمد مشمولہ انتخاب مضامین سرسید

مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور، ص:۸۰)

اس طرح سرسید احمد نے اپنے مضامین میں موضوع اور خیال کی مناسبت سے اسلوب اختیار کیا ہے۔ ان کے مضامین میں برجستہ جملے اور فقرے کے ساتھ ساتھ زور بیان کی شادابی بھی ہے۔ کہیں کہیں ڈرامائی شان بھی موجود ہے۔ انہوں نے اپنے مضامین میں موقع کی مناسبت سے محاورے اور ضرب الامثال کا استعمال کیا ہے۔ ان کے مضامین کی زبان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ضرورت کے مطابق دوسری زبان کے الفاظ کو بھی اردو میں شامل کیا ہے۔

سرسید احمد کی دوسری تحریروں میں معروضی طرز بیان اختیار کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ وہ اسلام پر مستحکم ایمان رکھتے تھے اور اسلام کے خلاف بولنے والے کی مدلل تردید کرتے تھے۔ نئی نسل کی رہبری اور اسلامی فکر کی تشکیل جدید میں ان کی تحریریں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔ وہ تاریخ کے تہذیبی تسلسل کے قائل تھے۔ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ قدیم ہندوستان اور قرون وسطیٰ کے تہذیبی اور آثاری سرمائے میں یکساں دلچسپی لی اور دہلی کے آثار قدیمہ کے تحفظ کی عملی کوششیں کیں۔ تحقیق کرنے والوں کے لیے ان کی کوششیں بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انہوں نے اردو میں سنجیدہ علمی تحریر لکھنے کا رواج ڈالا۔ زندگی کے بیشتر شعبوں میں انہوں نے حرکت و عمل کی روح پھونک دی اور تہذیب کا ایک وسیع تصور عام کیا اور علمی نثر کو فروغ دیا۔

☆☆☆

حاصل مطالعہ

Conclusion

حاصل مطالعہ

نثر کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ انسان کی تہذیبی و تمدنی ارتقا سے اس کا رشتہ وابستہ رہا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو انسان اور حیوان میں فرق قائم کرتی ہے۔ یہی انسان کے خیال و جذبات کی ترسیل اور کیفیات کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ اس کے ذریعہ ایک انسان دوسرے انسان سے رابطہ قائم کرتا ہے اور اس کے ذریعہ علوم وفنون کے چراغ روشن کئے جاتے ہیں۔

نثر نہ صرف بول چال کی زبان ہے بلکہ یہ اظہار گفتگو اور تحریر دونوں صورتوں میں نمایاں ہے۔ اس کے کئی اقسام ہیں جیسے بول چال کی نثر، علمی نثر اور ادبی نثر۔

اردو نثر میں سب سے پہلے بزرگوں کے اقوال، مذہبی رسائل، سفرنامے، تراجم قرآن پاک، تفاسیر، لغات اور مرزا مغل اور ان کی تصانیف وغیرہ نظر آتے ہیں۔

اردو داستانیں بھی انیسویں صدی سے قبل ترقی کی بہت ساری منزلیں طے کر چکی تھیں۔ قدیم داستانوں میں ''قصہ مہر افروز دلبر''، ''نوطرز مرصع'' اور ''عجائب القصص'' وغیرہ اہمیت کی حامل ہیں۔ اردو میں داستانیں فارسی کی وساطت سے آئیں۔

انیسویں صدی کی نثر کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے فورٹ ولیم کالج پر نگاہ ٹکتی ہے۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ملازموں کو اردو سکھانے کے مقصد سے یہ کالج کھولا گیا۔ اردو اس وقت سارے ملک کی ابھرتی ہوئی زبان تھی۔ اس لیے اسے انگریز ملازمین اور افسران بھی سیکھنے کے لیے مجبور ہو گئے۔

فورٹ ولیم کالج میں عربی، فارسی اور سنسکرت کے قصے کہانیوں کو آسان اردو میں ترجمہ کرایا گیا۔ اس کالج میں تاریخ، جغرافیہ اور قانون کی کتابوں کا بھی اردو میں ترجمہ ہوا۔ لیکن داستانیں چونکہ تہذیبی، سماجی، مذہبی اور اخلاقی قدروں کی عکاس ہوتی ہیں ساتھ ہی تفریح کا ذریعہ بھی اس لیے ان کا عام فہم اور سادہ زبان میں سب سے زیادہ ترجمہ کرایا گیا۔

انیسویں صدی کی نثر میں ''باغ و بہار'' کو اس لیے زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ اسکی نثر میں تازگی اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ یہ نثر ہندوستانی معاشرت کی عکاس اور تہذیبی و تمدنی روایات کی آئینہ دار ہے۔

انیسویں صدی میں ''طوطا کہانی''، ''قصہ لیلیٰ مجنوں''، ''آرائش محفل'' اور ''قصہ حاتم طائی'' وغیرہ بے حد مقبول ہوئیں۔ ان کتابوں میں مانوس الفاظ اور جملوں کے

ربط سے بیان میں ایسا لوچ پیدا کیا گیا ہے جو اس وقت کی کتابوں میں نہیں ہے۔

''داستان امیر حمزہ''، ''بیتال پچیسی'' اور ''نثر بے نظیر'' وغیرہ فورٹ ولیم کالج میں ترجمہ کی گئی اچھی داستانیں ہیں۔

انیسویں صدی کے وسط میں فورٹ ولیم کالج سے باہر بھی بہت سی داستانیں لکھی جا چکی تھیں ان میں ''گلشن نوبہار''، ''رانی کیتکی''، ''نورتن''، فسانۂ عجائب''، ''قصہ گل صنوبر''، ''قصہ الف لیلیٰ'' اور ''بوستان خیال'' وغیرہ کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ ان میں دو طرح کے اسلوب ہیں۔ ایک سادگی و سچائی کا غماز ہے تو دوسرا رنگینی اور تکلف کا حامل ہے۔ ان دونوں رجحانات کی آمیزش سے اس دور کی داستانوں میں سلاست اور ادبیت پیدا ہوتی ہے۔

انیسویں صدی کی نثر کو سمجھنے کے لئے اس دور میں لکھے گئے خطوط کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ مرزا غالبؔ کی خطوط نگاری نے بھی اونچا مقام حاصل کیا ہے۔ اس دور میں ان کے علاوہ رجب بیگ سرور، غلام غوث بے خبر اور واجد علی شاہ وغیرہ نے خطوط نگاری کے ذریعہ اردو نثر کو آگے بڑھایا۔

انیسویں صدی میں اردو صحافت نے بھی اردو نثر کو عوام سے قریب لانے میں

ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ اردو صحافت کا آغاز ۱۹۲۲ء میں اخبار ''جام جہاں نما'' سے ہوا لیکن اردو صحافت کو ۱۸۳۶ء کے بعد زیادہ ترقی ملی کیونکہ اسی سال اردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہوا تھا۔ اردو نثر کو آگے بڑھانے میں ''دہلی اردو اخبار''، ''سید الاخبار''، بنارس گزٹ''، ''جام جمشید''، ''محبّ ہند''، ''کوہ نور''، ''دریائے نور''، ''گوالیار گزٹ''، ''سحر سامری'' اور ''صادق الاخبار'' نے بھی اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔

ان اخبارات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انیسویں صدی میں عربی اور فارسی کے اثرات کم ہوتے گئے اور تصنع و تکلیف کا رنگ بھی بہت حد تک کم ہو گیا۔ اس دور کی اردو نثر میں علمی، سائنسی اور سیاسی اسلوب بھی نظر آتے ہیں۔

انیسویں صدی میں ''آب حیات'' اور نیرنگ خیال'' از محمد حسین آزاد کے چرچے بھی خوب رہے کیونکہ ان دونوں کتابوں میں آسان اور عام فہم نثر کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس دور میں ڈپٹی نذیر احمد کی نثر نے بھی گہری چھاپ چھوڑی ہے۔ شاد عظیم آباد کے ناول ''صورت الخیال''، ''رشیدۃ النساء کے'' اصلاح النسا'' اور افضل حسین کے ''فسانۂ خورشیدی'' وغیرہ میں نذیر احمد کے ناولوں کی نثر کی طرح سیدھا سادہ انداز بیان ہے۔

انیسویں صدی میں حاؔلی کی نثر نے بھی اردو نثر پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ انہوں نے

''مقدمہ شعر شاعری'' کے علاوہ کئی سوانح عمریاں لکھیں۔ ان کے یہاں بھی اس وقت اردو نثر کے جو مطالبات تھے وہ موجود ہیں۔

انیسویں صدی میں نواب محسن الملک، وقار الملک، مولوی چراغ علی، امداد امام اثر، وحید الدین سلیم اور مہدی افادی وغیرہ کے یہاں بھی سادہ نثر ملتی ہے۔

سر سید احمد شعر و ادب کی ترقی کے ساتھ ساتھ سائنسی تعلیم کا جدید نظام قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی تھی۔ لیکن دہلی کالج کی کارکردگی اس سے بھی زیادہ رہی کیونکہ اس کالج کے قیام سے اردو کے وسیلے سے بہت سے مغربی علوم سامنے آگئے۔ علم کیمیا، طبیعات ، ریاضیات، تاریخ، جغرافیہ سیاسیات، صحافت اور ادبیات پر کافی زور دیا گیا۔ ملک کی زبانوں میں مختلف علوم کی کتابیں منظر عام پر آئیں اور اردو نثر کا نیا مزاج پیدا ہوا۔

دہلی کالج میں جن لوگوں نے اپنی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ان میں مولوی ذکاء اللہ، نذیر احمد، امام بخش صہبائی، ماسٹر رام چندر، پنڈت من پھول، ڈاکٹر ضیاء الدین اور مولوی کریم الدین کے نام قابل ذکر ہیں۔

انیسویں صدی میں کچھ اہم ڈرامے بھی لکھے گئے۔ اردو نثر کو عام فہم بنانے

میں ان کی کارکردگی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ امانت لکھنوی، مداری لال اور آغا حشر کاشمیری وغیرہ کے نام انیسویں صدی کی ڈراما نگاری میں بڑے ہی ادب و احترام سے لیے جاتے ہیں۔

مندرجہ بالا باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انیسویں صدی سے پہلے اردو نثر پر فارسی کا گہرا اثر تھا لیکن رفتہ رفتہ یہ رنگ اترنا شروع ہوا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں جس نثر کی ابتدا داستانوں کے تراجم سے ہوئی تھی وہ ترقی کرتی ہوئی اس قابل ہوگئی کہ اس میں مختلف موضوعات پیش کئے جانے لگے۔ انیسویں صدی کے آخر تک اس کے اندر اتنی قوت پیدا ہوگئی کہ اس سے جدید نثر پیدا ہوئی۔

جہاں تک سرسید احمد (۱۸۱۷ء۔۱۸۹۸ء) کی ابتدائی اردو نثر کا سوال ہے تو وہ اردو کے اولین معماروں میں تھے۔ انہوں نے نہ صرف اردو نثر میں نکھار پیدا کیا بلکہ زندگی کے مسائل کے ساتھ اس کا رشتہ جوڑا اور اردو ادب کو نئی فکر اور نئی دنیا سے روشناس کرایا۔ سرسید احمد کا ذہن تغیر پذیر اور ترقی پذیر تھا اس لیے ان کی تعمیرانہ ذہن کا اثر ان کی تصانیف پر بھی پڑا۔ وقت اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ان کے افکار و نظریات میں بھی تبدیلی پیدا ہوتی رہی۔

سفر انگلستان سے پہلے ان کا ذہن قدیم خاندانی روایات کے اثر میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے بعد جب وہ انگریزی ملازمت میں آئے تو نئی فضاؤں کی روشنی پر اڑتے ہوئے مستشرقین یوروپ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش میں مصروف ہوگئے۔ سفر انگلستان سے پہلے جو کتابیں انہوں نے لکھیں ان میں مذہبی اور تاریخی نوعیت کی کتابیں زیادہ ہیں۔ ابتدا میں انہوں نے جو کتابیں لکھیں ان میں ''جام جم''، ''انتخاب الاخوین''، ''جلاؤ القلوب''، ''تحفۂ حسن''، تسہیل فی جر الثقیل''، ''فوائد الافکار''، ''آثار الصنادید''، ''قول متیں در ابطال حرکت زمین''، ''کلمۃ الحق''، ''راہ سنت در رد بدعت''، ''سلسلۃ الملوک'' ''ترجمہ کیمیائے سعادت''، ''تاریخ سرکشی ضلع بجنور''، ''تصحیح آئینۂ اکبری''، ''تاریخ سرکشی ضلع بجنور''، ''اسباب بغاوت ہند'' وغیرہ اہم ہیں۔

''جام جم'' سرسید احمد کی تالیف ہے۔ اس کا موضوع تاریخ ہے اور یہ فارسی زبان میں ہے۔ ۱۸۴۰ء میں یہ شائع ہوئی۔ اس میں امیر تیمور صاحبقراں سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کل ۴۳ بادشاہوں کا مختصر ذکر ہے۔

''انتخاب الاخوین'' ۱۸۴۱ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب سرسید احمد کی قانونی تالیف ہے۔ اس میں انہوں نے منصفی سے متعلق قانون دانی کا خلاصہ تیار کیا ہے۔

''جلاءُ القلوب بذکر المحبوب'' میں حضرت محمدؐ کی ولادت، معجزات، وفات اور دیگر حالات کا بیان ہے۔ یہ ۱۸۴۲ء میں دہلی سے چھپا تھا۔

''تحفۂ حسن'' شیعوں کی جانب سے کئے جانے والے اعتراضات اور جوابات پر مبنی ترجمہ شدہ رسالہ ہے۔ ۱۸۴۴ء میں تکمیل ہوا تھا۔

''فوائد الافکار'' ترجمہ پر مبنی ہے۔ ۱۸۴۶ء میں شائع ہونے والے اس رسالہ میں انہوں نے اپنے نانا سے پائے ہوئے میراث کو اردو جامہ پہنایا ہے۔

سر سید احمد کی ابتدائی تحریروں میں ایک اہم تصنیف ''آثار الصنادید'' ہے۔ سر سید احمد کو شہرت و مقبولیت اسی کتاب سے حاصل ہوئی۔ اس کتاب میں دہلی کے آثار قدیمہ کی تاریخ درج ہے۔ انہوں نے جان کو ہتھیلی پر رکھ کر قدیم کھنڈروں، عمارتوں اور اونچے اونچے میناروں کے کتبوں کو نزدیک سے پڑھا اور ان کا چربہ اتارا۔ سینکڑوں تاریخی کتابوں کے مطالعہ کے بعد یہ نادر تصنیف مکمل ہوئی ہے۔ ۱۸۴۷ء میں یہ کتاب منظر عام پر آئی۔ چار ابواب پر مشتمل اس کتاب کی ضخامت چھ سو صفحات ہے۔ اس میں شہر سے باہر ۱۳۰ عمارتوں کا بیان ہے جو پہلے باب میں درج ہے۔

دوسرے باب میں لال قلعہ اور اس کی عمارتوں کے بارے میں جزوی

عنوانات قائم کر کے ان پر الگ الگ روشنی ڈالی گئی ہے جو ۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

تیسرے باب میں شہر شاہ جہاں کے احوال درج ہیں۔اس باب میں اس شہر کی عمارتوں ، مسجدوں ، مدرسوں ، حویلیوں ، بازاروں ، مندروں ، بازاروں ، باؤلیوں اور کنوؤں کے تذکرے ، ان کا جغرافیہ اور محل وقوع کی نشاندہی کی گئی ہے۔

چوتھے باب میں قدیم وجدید قلعوں اور شہروں کا بیان ہے جو تادم تحریر دلی میں تعمیر اور آباد ہوئے تھے۔اس کے ساتھ ہی اس باب میں دلی کی آب و ہوا اور زبان کی پیدائش کا بیان قلم بند کیا گیا ہے۔اس حصے میں سرسید احمد خاں کی تحریر قدیم اسلوب کے جال میں پھنستی ہوئی نظر آتی ہے۔

''آثار الصنادید'' مکمل کرنے میں سرسید احمد کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس کا اندازہ اس کتاب کے مطالعہ اور اس میں شامل تصویروں ہی کو دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے۔کم وبیش سوا سو عمارتوں کی تحقیقات کے لیے ان عمارتوں کے طول وعرض وارتفاع کی پیمائش، ان کی صورت حال، ان کے کتبوں کے چربے اتارنا اور ہر ایک کتبہ کو بعینہٖ اصلی خط و خال میں پیش کرنا کتنا دشوار اور مشکل طلب ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

''آثار الصنادید'' کا پہلا ایڈیشن دیکھ کر رابرٹس جنہیں پرانی چیزوں کی

تحقیقات کا بہت شوق تھا، بے حد خوش ہوئے اور ان کا ترجمہ انگریزی میں کرانے کی خواہش ظاہر کی۔ سر سید احمد نے اس میں جو کمی تھی اسے پورا کر کے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کروایا۔ جب اس کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہوا تو سر سید احمد پورے یوروپ میں مشہور ہو گئے۔ انہیں انعامات و اعزازات سے بھی نوازا گیا۔

دوسرے ایڈیشن کی زبان سیدھی سادی اور عام فہم ہے۔ ''قول متین در ابطال حرکت زمیں'' ۱۸۴۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں علمی اور سائنسی موضوع کو اٹھایا گیا ہے۔

''کلمۃ الحق'' ۱۸۴۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں سر سید احمد نے مذہبی مسائل میں رائج ہو جانے والے غلط عقائد کے تعلق سے بحث کی ہے۔ مذہبی تصانیف میں اس کتاب کی بڑی اہمیت ہے۔

''راہ سنت در رد بدعت'' ایک ایسی کتاب ہے جسے سر سید احمد نے ۱۸۵۰ء میں لکھی ہے۔ اس میں بدعت کے خلاف آواز اٹھائی گئی ہے۔

''سلسلۃ الملوک'' ایک تاریخی کتاب ہے جو ۱۸۵۲ء میں مرتب ہوئی ہے۔ اس میں ان راجاؤں اور بادشاہوں کی فہرست اور مختصر حالات درج ہیں جو لگ بھگ پانچ ہزار سال سے دہلی میں عہد بہ عہد فرمارواہوتے چلے آئے تھے۔

''تاریخ ضلع بجنور''، محکمہ صدر بورڈ کے فرمان کے مطابق سر سید احمد خاں نے ۱۹۵۵ء میں بڑی محنت اور جانفشانی سے تاریخ بجنور لکھی اور ضلع حکام کے حوالے کر دیا۔ افسوس کا مقام ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں یہ مسودہ کہیں گم ہو گیا اور اشاعت کے مرحلے سے نہیں گزر سکا۔

''تصحیح آئینۂ اکبری''، ''آئینۂ اکبری'' از ابوالفضل کی کتاب جو غلطیوں سے پرتھی اور فارسی میں تھی، اس کا ترجمہ سلیس اردو میں کر کے شائع کروایا۔ یہ کتاب بے حد مقبول ہوئی تھی۔

''تاریخ سرکشی ضلع بجنور'' میں سر سید احمد نے پہلی جنگ آزادی جو ناکام ہو گئی تھی اور انگریزوں نے جس کا نام غدر دیا تھا کے تاریخی حالات ضلع بجنور لکھی۔ ہر طرف بغاوت چل رہی تھی اس کے باوجود سر سید احمد خاں نے کوئی پرواہ کئے بغیر اس کتاب کے لیے مواد جمع کیا۔

''اسباب بغاوت ہند'' ۱۸۵۸ء میں چھپی تھی۔ اس کتاب میں ضلع بجنور میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں سر سید نے نہایت مدلل انداز میں مسلمانوں کو بے قصور ثابت کیا ہے اور انگریزوں کی سختیاں گنائی ہیں۔ سر سید کا یہ

کارنامہ بہت اہم ہے۔ انگریزی حکومت میں رہتے ہوئے مسلمانوں کی بہت سی شکایتوں کو سامنے لانا اور سچائی بیان کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس کتاب کے بعد انگریزوں کا مسلمانوں کے خلاف غیض وغضب ختم ہوا اور حالات رفتہ رفتہ معمولی پر آئے۔

سرسید نے دورۂ انگلستان سے قبل جو کتابیں لکھیں ان میں نئے طرز بیان سے لوگوں کو روشناس کرایا۔ اردو نثر میں یہ ان کا اہم کام ہے۔ اسلوب میں جدید رجحانات کے لیے سرسید احمد نے راستہ صاف کیا اور اسے معاشرے کا ترجمان بتایا۔

سرسید احمد خاں کے مضامین موضوع اور مواد کے لحاظ سے قابل ستائش ہیں۔ انہوں نے اپنے مضامین کے ذریعہ قوم کی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے اندر ایک نئی روشنی پیدا کی ہے۔ ان کے مضامین میں ہر طرح کے موضوعات ملتے ہیں۔ انہوں نے ''جہالت''، ''کاہلی''، ''ریاکاری''، ''قومی نفاق'' ''تعلیم، ''تعلیم نسواں''، ''خود اعتمادی''، ''رسم ورواج''، ''اپنی مدد آپ''، ''عورتوں کے حقوق'' اور ''تربیت اطفال'' جیسے بہت سے اہم مضامین لکھے۔

سرسید احمد کے کچھ مضامین کو کئی لوگوں نے افسانے کے خانے میں رکھا ہے۔ مثلاً ''امید کی خوشی''، ''گزرا ہوا زمانہ''، ''بحث وتکرار'' اور ''سراب حیات'' وغیرہ۔ دوسرے

مضامین کی طرح ایسے مضامین بھی اصلاح ہی کی غرض سے لکھے گئے ہیں لیکن ان میں تخیل سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ جس طرح افسانے اور انشائیے میں اصلاح کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور ہوتا ہے اسی طرح سر سید احمد کے ایسے مضامین جن میں تخیلات کا غلبہ ہے، بھی اصلاح ہی کی غرض سے لکھے گئے ہیں لیکن ان میں انشا کا رنگ غالب ہے۔ انہیں تخلیقی نثر کے زمرے میں بھی رکھا جا سکتا ہے:

> ''برس کی اخیر رات کو ایک بڈھا اپنے اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے۔ رات بھی ڈراؤنی اور اندھیری ہے۔ گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی ہے۔ آندھی بڑے زور سے چلتی ہے۔ دل کانپتا ہے اور دم گھبراتا ہے۔ بڈھا نہایت غمگین ہے مگر اس کا غم نہ اندھیرے گھر پر ہے نہ اکیلے پن پر اور نہ اندھیری رات اور نہ بجلی کی کڑک اور آندھی کی گونج پر اور نہ برس کی اخیر رات پر۔ وہ اپنے پچھلے زمانہ کو یاد کرتا ہے اور جتنا زیادہ یاد آتا ہے اتنا ہی غم بڑھتا ہے۔ ہاتوں سے ڈھکے ہوئے منہ پر آنکھوں سے آنسو بھی بہے چلے جاتے ہیں۔

پچھلا زمانہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے۔ اپنا لڑکپن اس کو یاد آتا ہے جب کہ اس کو کسی چیز کا غم اور کسی بات کی فکر دل میں نہ تھی۔ روپیہ اشرفی کے بدلے ریوڑی اور مٹھائی اچھی لگتی تھی۔ سارا گھر ماں باپ بھائی بہن اس کو پیار کرتے تھے۔ پڑھنے کے لئے چھٹی کا وقت جلد آنے کی خوشی میں کتابیں بغل میں لے مکتب میں چلا جاتا تھا۔ مکتب کا خیال آتے ہی اس کو اپنے ہم مکتب یاد آتے تھے۔ وہ اور زیادہ غمگین ہوتا تھا اور بے اختیار چلا اٹھتا تھا۔ ہائے وقت ہائے وقت ہائے ہائے گذرے ہوئے زمانے۔"

(گزرا ہوا زمانہ)

سر سید احمد کے دور میں مسلمانوں کا زوال ہو چکا تھا۔ مغلیہ دور حکومت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے اقتدار کا بھی خاتمہ ہو چکا تھا۔ پہلی جنگ آزادی کی شکست کے بعد حالات یکسر بدل چکے تھے۔ مسلمان انگریز حاکموں کے غیض و غضب کے نشانہ بن رہے تھے۔ ان کے ہاتھ سے زمینداری، جاگیرداری اور دوسرے بڑے عہدے نکل چکے

تھے۔ مسلمان اقتصادی طور پر پوری طرح کمزور ہو گئے تھے۔ بڑی بڑی حویلیاں اور محل سرائیں تباہ و برباد ہو چکی تھیں۔ سر سید احمد نے اپنے مضامین کے ذریعہ مسلمانوں کے اندر ایک نئی روح پھونکنے کی کوشش کی۔ ان کے مضامین کے موضوعات مسلمانوں کی صورت حال کے گرد گھومتے ہیں۔ ان کی جہالت، غلط عقائد، رہن سہن، لباس اور دوسری بری عادتوں سے انہیں اپنے مضامین کے ذریعہ روکنے کی کوشش کی۔

ان کے مضامین کے موضوعات میں قومی نفاق، ظاہر داری، خوشامد اور ظاہر داری بھی شامل ہے۔ سر سید کو سب سے زیادہ فکر مسلمانوں کی تعلیم کے تعلق سے تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ قوم کے سارے امراض کا علاج صرف تعلیم ہے۔ وہ مغربی تعلیم کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔ خواتین کو بھی وہ تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ سر سید احمد نے اپنی ساری زندگی مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت کے لیے وقف کر دی تھی۔

سر سید احمد نے دنیا سے بے تعلقی کے نقصانات سے بھی اپنے مضامین کے ذریعہ مسلمانوں کو روکا اور اقبال کی طرح قوم کو بے عملی سے نجات دلائی۔

اس طرح موضوع اور مواد کے لحاظ سے سر سید احمد کے مضامین قابل ستائش ہیں۔ انہوں نے اپنے مضامین کے ذریعہ قوم کی اصلاح کی، قوم کے وقار کو اوپر اٹھانے کی

کوشش کی۔

جہاں تک سر سید احمد کے مضامین کی زبان اور اسلوب کا سوال ہے تو انہوں نے اردو نثر کو نہ صرف اپنی زندگی کا بلکہ پورے معاشرے کا ترجمان بنایا۔ اس لیے انہیں نئی اردو نثر کا موجد بھی کہا جاتا ہے۔ سر سید احمد کا عظیم الشان مقصد تھا۔ اس مقصد میں سیاسی اور تعلیمی مشن کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ ان دونوں اثرات کے امتزاج سے ان کی تحریروں میں ایک ایسا رنگ پیدا ہو گیا جو سر سید احمد ہی کا رنگ کہا جا سکتا ہے۔

سر سید احمد کے نزدیک مضمون اور دل سے نکلا ہوا مضمون طرز ادا پر مقدم ہے کیونکہ مضمون کے بغیر طرز ادا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ سر سید احمد کی تحریر نے اردو نثر پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ ان کے مضامین میں کھلی تلقین پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے کہیں کہیں مسرت اور دلچسپی کا وصف کم ہو گیا ہے۔ ان کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی موضوع اور ہیئت میں آہنگی ہے۔ سادگی کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں زور بیان کی شادابی و شگفتگی بھی ہے۔ ان کے بعض مضامین میں محاکاتی وصف بھی پر اثر ہے۔

سر سید کی تحریروں میں تشبیہات و استعارات بھی ہے اور کہیں کہیں ڈرامائی

شان بھی ہے۔ جا بجا ضرب المثل اور روزہ مرہ محاورے بھی ان کے مضامین میں مل جاتے ہیں جن سے ان کی نثر کی بے ساختگی اور زبان وادا کی شگفتگی نکھر کر سامنے آجاتی ہے:

''ناموری کی مثال نہایت عمدہ خوشبو کی ہے جب ہوشیاری اور سچائی سے ہماری واجب تعریف ہوتی ہے تو اس کا ویسا ہی اثر ہوتا ہے جیسے عمدہ خوشبو کا۔ مگر جب کسی کمزور دماغ میں زبردستی وہ خوشبو ٹھونس دی جاتی ہے تو ایک تیز بو کی مانند دماغ کو پریشان کر دیتی ہے۔ فیاض آدمی کو بدنامی اور نیک نامی کا زیادہ خیال ہوتا ہے اور عالی ہمت طبیعت کو مناسب عزت اور تعریف سے ایسی ہی تقویت ہوتی ہے جیسے کہ غفلت اور حقارت سے پست ہمتی ہوتی ہے۔ جو لوگ کہ عوام کے درجہ سے اوپر ہیں انہی لوگوں پر اس کا زیادہ اثر ہوتا ہے جیسے کہ تھرمامیٹر میں وہی حصہ موسم کا زیادہ اثر قبول کرتا ہے جو صاف اور سب سے اوپر ہوتا ہے۔''

(خوشامد)

سرسید احمد دوسری زبان کے الفاظ کو اپنی زبان میں شامل کرنے کو بہت ضروری سمجھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اردو زبان میں ہمیشہ نئے نئے لفظ ملتے رہیں اور اردو زبان ترقی کرتی رہے۔ عربی زبان کی ترقی کی وجہ یہی ہے کہ یہ زبان نئے علوم وفنون کے ساتھ نئے الفاظ شامل کرتی رہی ہے۔ قرآن کریم کی مثال دے کر وہ بتاتے ہیں کہ اس میں دوسری زبانوں کے بہت سے الفاظ شامل ہیں۔

سرسید کے یہاں بہت سے متروک الفاظ بھی مل جاتے ہیں جیسے لاویں، جاویں، کھاویں وغیرہ۔ کہیں کہیں تذکیر وتانیث کا بھی خیال نہیں رکھا گیا ہے مثلاً غل مچائی، چمک آئی اور رسم بنائی وغیرہ۔

بہر حال سرسید احمد کے مضامین کی زبان اور اسلوب میں چند معائب کو چھوڑ کر دیکھا جائے تو ان کے نثری کارنامے بہت اہم ہیں۔

سرسید احمد خاں کی تصنیفی زندگی کو کئی خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ جیسے مذہبی، تاریخی، سیاسی اور اصلاحی۔

اس طرح جب ہم سرسید احمد خاں کے مضامین سے ان کی دوسری تحریروں کا موازنہ کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ ان کی ابتدائی نثرِ پرانے رنگ کی ہے اور اس کے بعد والی

تحریروں میں مغربی طرز زندگی اور جدید خیالات کا کچھ اثر دکھائی دیتا ہے۔اس کے علاوہ ان کی دوسری تحریروں میں مناظرہ، تقابل اور مذاہب وغیرہ کا رنگ گہرا ہے۔ ابتدائی تحریروں میں ان کا نظریہ خالص علمی اور دینی تھا۔آثار قدیمہ سے بھی دلچسپی تھی۔اس دور میں انہوں نے قدیم موضوعات کو نئے طرز بیان سے روشناس کرایا لیکن انہوں نے مضامین کے ذریعہ پرتکلف فارسی اسالیب سے اردو نثر کو آزاد کرایا اور اسے پورے معاشرہ کا ترجمان بنایا۔

مختصر یہ کہ سرسید احمد کثیر الجہات مصنف تھے۔ان کے کارناموں کو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔

☆☆☆

کتابیات

Bibliography

کتابیات

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف/مرتب	مطبع	مقام	سن اشاعت
۱۔	اصول تحقیق و ترتیب و متن	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	دہلی	۱۹۹۴ء
۲۔	ارباب نثر اردو	سید محمد	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس	دہلی	۱۹۷۷
۳۔	ادب کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر سلام سندیلوی	نسیم بک ڈپو	لکھنو	۱۹۷۳ء
۴۔	ادبی اشارے	ڈاکٹر سلام سندیلوی	نسیم بک ڈپو	لکھنو	۱۹۶۹ء
۵۔	اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ	سنبل نگار	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	علی گڑھ	۱۹۹۹ء
۶۔	اردو اسالیب نثر	امیر اللہ شاہین	جمال پرنٹنگ پریس	دہلی	۱۹۷۷ء
۷۔	اردو نثر میں ادب لطیف	ڈاکٹر عبدالودود خاں	نسیم بک ڈپو	لکھنو	۱۹۸۰ء
۸۔	اردو اور قومی تذکرے	کشن پرساد کول	انجمن ترقی اردو ہند	علی گڑھ	۱۹۸۲ء
۹۔	اصناف ادب اردو	ڈاکٹر قمر رئیس	سرسید بک ڈپو	علی گڑھ	۱۹۸۲ء
۱۰۔	اردو زبان اور فن داستان گوئی	کلیم الدین احمد	ادارۂ فروغ اردو	لکھنو	۱۹۷۲ء

۱۱۔ اردو شاعری کا سماجی پس منظر — ڈاکٹر سید اعجاز حسین — تاج آفسٹ پریس — الہ آباد — ۱۹۷۳ء

۱۲۔ آج کا اردو ادب — ڈاکٹر ابواللیث صدیقی — ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس — علی گڑھ — ۱۹۷۵ء

۱۳۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام — مولوی عبدالحق — انجمن ترقی اردو ہند — علی گڑھ — ۱۹۶۸ء

۱۴۔ اردو کی قدیم داستانیں — ایم حبیب خاں — یوپی اردو اکادمی — لکھنو — ۱۹۷۴ء

۱۵۔ اردو زبان و ادب — شفیق الزماں — مسلم اسٹوڈنٹ ایسوسی ایشن — پٹنہ — ۱۹۸۴ء

۱۶۔ اردو کی نثری تاریخ میں سرسید کا مقام — سید سلطان محمود — نعمان پریس — دہلی — ۱۹۷۷

۱۷۔ اردو کا آغاز و ارتقا — ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ — مجلس تحقیقات — حیدر آباد — ۱۹۹۱ء

۱۸۔ اردوئے قدیم — حکیم شمس اللہ قادری — نولکشور پریس — لکھنو — ۱۹۶۷ء

۱۹۔ اردو انسائیکلو پیڈیا — قومی کونسل — قومی کونسل برائے فروغ اردو — دہلی — ۱۹۹۶ء

۲۰۔ ازالتہ العین عن ذوالقرنین — سرسید احمد — مفید عام پریس — آگرہ — ۱۹۸۹ء

۲۱۔ اسباب بغاوت ہند — سرسید احمد — یونیورسیٹی پبلشرز — علی گڑھ — ۱۹۵۸ء

۲۲۔ اسلوب — عابد علی عابد — ایجوکیشنل بک ہاؤس — علی گڑھ — ۱۹۷۶ء

۲۳۔ انتخاب مضامین سرسید — مرتبہ عتیق صدیقی — اتر پردیش اکادمی — لکھنو — ۱۹۸۳ء

۲۴۔ ادبی تنقید کے اصول	کلیم الدین احمد	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ	دہلی	۱۹۸۵ء
۲۵۔ انقلاب ۱۸۵۷ تصویر کا دوسرا رخ	شیخ حسام الدین	اتر پردیش اردو اکادمی	لکھنو	۱۹۹۱ء
۲۶۔۔انتخاب مضامین علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ	مرتبہ اصغر عباس	اتر پردیش اردو اکادمی	لکھنو	۱۹۷۲ء
۲۷۔ اردو کے چند نامور ادیب وشاعر	ڈاکٹر حامد اللہ ندوی	موڈرن پبلشنگ ہاؤس	دہلی	۱۹۹۵ء
۲۸۔ اعمال نامہ	سر رضا علی	ہندوستانی پبلشرز	دہلی	۱۹۴۳ء
۲۹۔ بہار میں تخلیقی نثر	ڈاکٹر قیام نیر	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	دہلی	۲۰۱۴ء
۳۰۔ اردو نثر ایک مطالعہ	قاضی مشتاق احمد	موڈرن پبلشنگ ہاؤس	دہلی	۲۰۰۵ء
۳۲۔ بہار میں اردو نثر کا ارتقا	مظفر اقبال	کتاب خانہ	پٹنہ	۱۹۸۰ء
۳۳۔ تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ	نولکشور پریس	لکھنو	تیسرا
۳۴۔ تنقیدی تقاضے	ڈاکٹر مشتاق احمد	ادارہ جہاں اردو	دربھنگہ	۲۰۰۳ء
۳۵۔ تاریخ ادب اردو حصہ اول	جمیل جالبی	ایجوکیشنل بک ہاؤس	دہلی	۱۹۷۷ء
۳۶۔ تنقیدی جہات	ڈاکٹر شہزاد انجم	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	دہلی	۲۰۱۱ء
۳۷۔ تنقیدی گوشے	ڈاکٹر رئیس انور	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	دہلی	۲۰۱۱ء

۳۸۔ تنقید کی زبان ڈاکٹر کمال الدین دی آزاد پریس پٹنہ ۲۰۰۰ء

۳۹۔ تاریخ ادب اردو ڈاکٹر وہاب اشرفی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۰۸ء

۴۰۔ تجربہ و تجزیہ ڈاکٹر سلام سندیلوی نسیم بک ڈپو لکھنو ۱۹۷۱ء

۴۱۔ جدید اردو ادب کا بانی ابو اللیث صدیقی مسلم یونیورسیٹی علی گڑھ ۱۹۳۸ء

۴۲۔ جادۂ اعتدال عبد المغنی آرٹ پریس پٹنہ ۱۹۷۲ء

۴۳۔ حیات جاوید الطاف حسین حالی ترقی اردو بیورو دہلی ۱۹۷۹ء

۴۴۔ داستان تاریخ اردو حامد حسن قادری لکشمی پریس آگرہ ۱۹۶۶ء

۴۵۔ ریسرچ کیسے کریں ڈاکٹر نور الاسلام صدیقی شاد پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۰ء

۴۶۔ زاویۂ نگاہ خلیل الرحمٰن اعظمی آدرش پبلشرز گیا ۱۹۶۶ء

۴۷۔ سرسید (کتابچہ) خلیق احمد نظامی رعنا پبلشرز نئی دہلی نئی دہلی ۱۹۷۴ء

۴۸۔ سرسید احمد خاں ظہیر الدین احمد ادارۂ ادبیات حیدر آباد ۱۹۳۹ء

۴۹۔ سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا کی نثر کا فکری اور فنی جائزہ ڈاکٹر سید عبد اللہ چمن بک ڈپو دہلی ۱۹۶۰ء

۵۰۔ سرسید احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ عتیق صدیقی مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی ۱۹۷۷ء

۵۱۔ سرسید اور ہندوستانی مسلمان | نورالحسن نقوی | ایجوکیشنل بک ہاؤس | علی گڑھ | ۱۹۷۹ء

۵۲۔ سرسید اور علی گڑھ تحریک | خلیق احمد نظامی | ایجوکیشنل بک ہاؤس | علی گڑھ | ۱۹۷۹ء

۵۳۔ سرسید احمد خاں کا سفرنامہ پنجاب | طبع دوم | ایجوکیشنل بک ہاؤس | علی گڑھ | ۱۹۷۹ء

۵۴۔ سرسید احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ | عتیق صدیقی | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ | دہلی | ۱۹۷۷ء

۵۵۔ سرسید کی تعلیمی تحریک | اختر الواسع | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ | دہلی | ۱۹۸۵ء

۵۶۔ سرسید تاریخی وسیاسی آئینے میں | ڈاکٹر شان محمد | انور بک ڈپو | علی گڑھ | ۱۹۶۷ء

۵۷۔ سرسید کی صحافت | اصغر عباس | انجمن ترقی اردو | دہلی | ۱۹۷۵ء

۵۸۔ سرسید کی یاد | حبیب الرحمٰن خاں شروانی | مسلم یونیورسٹی پریس | علی گڑھ | ۱۹۲۵ء

۵۹۔ سرسید کے خطوط | مرتبہ وحیدالدین سلیم | حالی پریس | پانی پت | ۱۹۰۱ء

۶۰۔ سرسید شاہ امین الدین اعلیٰ | حسینی شاہد | انجمن ترقی اردو | حیدرآباد | ۱۹۷۳ء

۶۱۔ علی گڑھ تحریک | مرتبہ نسیم قریشی | مسلم پریس | لکھنو | ۱۹۶۰ء

۶۲۔ علی گڑھ ماضی وحال | رشید احمد صدیقی | مسلم یونیورسٹی | علی گڑھ | ۱۹۷۰ء

۶۳۔ غدر کی صبح وشام | خواجہ حسن نظامی | ہمدرد پریس | دہلی

۶۴۔ فسانۂ عجائب	رجب علی بیگ سرور	صفیہ اکیڈمی	کراچی	۱۹۶۷ء
۶۵۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات	ڈاکٹر عبیدہ بیگم	نصرت پبلیشرز	لکھنو	۱۹۸۳ء
۶۶۔ قدیم دلی کالج	مالک رام	جمال پرنٹنگ پریس	دہلی	۱۹۷۶ء
۶۷۔ کاروان صحافت	ڈاکٹر عبدالسلام خورشید	انجمن ترقی اردو	دہلی	۱۹۶۴ء
۶۸۔ کربل کتھا	فضل علی فضلی	ادارۂ تحقیقات اردو	پٹنہ	۱۹۶۵ء
۶۹۔ کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ	وحید قریشی	مکتبہ ادب جدید	لاہور	۱۹۶۵ء
۷۰۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد	محمد عتیق صدیقی	انجمن ترقی اردو	علی گڑھ	۱۹۶۰ء
۷۱۔ گنج خوبی	ترجم خواجہ احمد فاروقی	دہلی یونیورسیٹی	دہلی	۱۹۶۶ء
۷۲۔ مرحوم دہلی کالج	عبدالحق	ترقی اردو ہند	دہلی	۱۹۴۵ء
۷۳۔ مسافران لندن	سید احمد خاں	مجلس ترقی ادب	لاہور	۱۹۶۰ء
۷۴۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل	سید طفیل احمد	کتب خانہ عزیزیہ	دہلی	۱۹۵۴ء
۷۵۔ مضامین سرسید احمد خاں	عبدالحق	ایجوکیشنل بک ہاؤس	علی گڑھ	۱۹۸۴ء
۷۶۔ مقالات سرسید	عبداللہ خاں خویشگی	نیشنل پرنٹرس	علی گڑھ	۱۹۵۲ء
۷۷۔ مقدمہ شعروشاعری	الطاف حسین حالی	ایجوکیشنل بک ہاؤس	علی گڑھ	۱۹۷۷ء

۷۸۔ مکاتیب سرسید احمد خاں	مرتبہ مشتاق حسین	یونین پرنٹنگ پریس	دہلی	۱۹۶۰ء
۷۹۔ ملا وجہی	جاوید وششٹ	ساہتیہ اکادمی	دہلی	۱۹۸۵ء
۸۰۔ نظر اور نظریے	آل احمد سرور	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ	دہلی	۱۹۷۳ء
۸۱۔ نوطرز مرصع	مرتبہ نورالحسن ہاشمی	ہندوستان اکادمی	الہ آباد	۱۹۵۸ء
۸۲۔ نئے اور پرانے چراغ	آل احمد سرور	ادارۂ فروغ اردو	لکھنو	۱۹۶۳ء
۸۳۔ ہماری داستانیں	وقار عظیم	اردو مرکز	لاہور	۱۹۶۴ء
۸۴۔ ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں	عابد حسین	مکتبہ جامعہ لیمیٹیڈ	دہلی	۱۹۶۶ء
۸۵۔ ہندوستانی مسلم سیات پر ایک نظر	محمد اشرف	نئی روشنی پرکاشن	دہلی	۱۹۶۳ء

☆☆☆

رسائل وجرائد

۱۔ آج کل	دہلی	اگست	۱۹۸۰ء
۲۔ آج کل	دہلی	نومبر	۱۹۸۱ء
۳۔ آج کل	دہلی	اگست	۱۹۸۲ء
۴۔ آہنگ	گیا	شمارہ ۳	۱۹۷۰ء
۵۔ آہنگ	گیا	شمارہ ۵	۱۹۷۰ء
۶۔ آہنگ	گیا	شمارہ ۹	۱۹۷۱ء
۷۔ آہنگ	گیا	شمارہ ۳۷	۱۹۷۳ء
۸۔ آہنگ	گیا	شمارہ ۶۱	۱۹۷۵ء
۹۔ الفاظ	علی گڑھ	مئی، جون	۱۹۷۸ء
۱۰۔ الفاظ	علی گڑھ	جنوری تا اپریل	۱۹۸۱ء
۱۱۔ زبان وادب	پٹنہ	اگست تا دسمبر	۱۹۸۰ء
۱۲۔ زبان وادب	پٹنہ	جولائی تا ستمبر	۱۹۸۴ء

۱۳۔ زبان وادب	پٹنہ	جولائی تا ستمبر	۱۹۸۶ء
۱۴۔ زبان وادب	پٹنہ	اگست	۲۰۰۵ء
۱۵۔ زبان وادب	پٹنہ	اکتوبر	۲۰۰۹ء
۱۶۔ زبان وادب	پٹنہ	ستمبر	۲۰۱۲ء
۱۷۔ زبان وادب	پٹنہ	نومبر	۲۰۱۲ء
۱۸۔ زبان وادب	پٹنہ	جنوری	۲۰۱۳ء
۱۹۔ شاعر	ممبئی	افسانہ نمبر	۱۹۶۲ء
۲۰۔ صبح نو	پٹنہ	ہمعصر اردو ادب نمبر	۱۹۷۷ء
۲۱۔ صبح نو	پٹنہ	ہمعصر اردو ادب نمبر	۱۹۶۲ء
۲۲۔ صنم	پٹنہ	اکتوبر	۱۹۶۱ء
۲۴۔ عصری آگہی	دہلی	مارچ	۱۹۸۰ء
۲۵۔ عصری آگہی	دہلی	جولائی، اکتوبر	۱۹۹۰ء
۲۶۔ کتاب نما	دہلی	جون	۱۹۸۳ء
۲۷۔ کتاب نما	دہلی	جولائی	۱۹۸۹ء

۲۸۔ کتاب نما	دہلی	مارچ	۲۰۰۱ء
۲۹۔ کتاب نما	دہلی	اپریل	۲۰۰۷ء
۳۰۔ کتاب نما	دہلی	فروری	۲۰۱۳ء

☆☆☆

اخبارات

١۔ انقلاب جدید	روزنامہ	پٹنہ
٢۔ انقلاب	روزنامہ	دہلی
٣۔ الجمیعت	ہفت روزہ	دہلی
۴۔ اخبار مشرق	روزنامہ	دہلی
۵۔ پرتاپ	روزنامہ	دہلی
٦۔ پیسہ	ہفتہ وار	پنجاب
٧۔ تیج	روزنامہ	دہلی
٨۔ جہان ہند	ہفت روزہ	دہلی
٩۔ دعوت	سہ روزہ	دہلی
١٠۔ راشٹریہ سہارا	روزنامہ	نوئیڈا
١١۔ سیاست	روزنامہ	دہلی
١٢۔ سیاست	روزنامہ	حیدرآباد

school of modern prose as he not only made a marvellous pattern but motivated a number of friends and followers like Hali, Zakaullah, Mohsinul Mulk etc.

This research work would dialogue the basics of his essays which was still untouched, the findings will definitely contribute a lot to the history of Urdu literature.

(6) Research Methodology - to be adopted:

As a first step of this research , all the essays of Sir Syed will be studies and a topics- wise list will be prepared.

In the next step, content and language of various essays will be assessed to know as if the topic has any role in expression and language.

There after, the common topics of other writings of Sir Syed will be searched out to compare them with the essays in respect of content and langauge.

Lastly, All the peculiar features and characteristics of the essays will be elaborated in findings of the work.

(7) Work Design:

Fore word

۱۹ویں صدی میں اردو نثر۔ایک طائرانہ نظر

Chapter I : Urdu Prose in 19th Century - a bird's eye view

سرسید کی ابتدائی اردو نثر (سفر انگلستان سے قبل)

Chapter II: Early Urdu Prose of Sir Syed (before his jouney to England.

مضامین سرسید۔موضوع ومواد

Chapter III: Essays of Sir Syed - Topics & Contents.

مضامین سرسید۔زبان اور اسلوب

Chapter IV: Essays of Sir Syed - Language & Style.

مضامین سرسید کا ان کی دوسری تحریروں سے موازنہ

Chapter V: Comparision of essays with other writings of Sir Syed.

Conclusion حاصل مطالعہ

Bibliograpy کتابیات

نگراں Approved. 20.06.12 مقالہ نگار

Farhat Band 15.06.12

(Supervisor) Researcher)

Contents and Language of Sir Syed's Essays - A Study

Thesis Submited to

L.N.Mithila University

Darbhanga

For the degree of

Doctor of Philosophy

in Urdu

2016

Supervisor

Dr. Barkat Ali

MA (Double) Ph.D. (PU)

Associate Professor

& HoD Urdu

M.L.S.M. Cellege

Darbhanga

Farhat Bano

Researcher

Farhat Bano

Muraitha, Jale

Dist: Darbhanga

Bihar

SYNOPSIS FOR Ph.D. DEGREE IN URDU

(Faculty of Humanities)

Uncer L.N.M. University, Kameshwarnagar, Darbhanga

Name of Researcher : **FARHAT BANO**

Name of Supervisor : **Dr. Barkat Ali**

Associate Professor

H.O.D. Urdu

M.L.S.M. College, Darbhanga

Forwarded 20-5-16

(1) Title of the Research work:

مضامین سرسید کے موضوعات، موادوزبان کا مطالعہ

Contents and languages of Sir Syed's Essays.

(2) Statement of Research of Problems:

The great urdu essayist, Sir Syed not only wrote a large number of essays is Urdu but started to express domestic, Social, Cultural, Political and Historical issues in a very simple and lucid language. Although, this type of language was introduced by the munshies of Fort William College and Ghalib also adopted the some pattern in his letters, the style of expression of Sir Syed in unique in Urdu. It seems that he, always keeps the common readers in his mind.

In this context, the analytical study of the topics, contents and language of the essays of Sir Syed will be meaningful in

understanding the issues which were prevailing during the last four decades of 19th century.

(3) Objective of the research work:

Generally, It is said by some writers that Sir Syed was a great essayist and he was a trend setter. But the feature, Elements and shades of his essays have not been analysed. Hence the main objective of the research works to focus this aspect of his essays. The comprehensive and intensive study of his essays will reflect the inside picture of Sir Syed's personality.

(4) Research Coverage-theme & Area:

This research work will cover all the writings specially the essays of Sir Syed as secondary sources, the opinions of writers as well as other dignitaries will also come under the purview of this work. So that the findings may be significant and for reaching.

(5) Contribution of research work to the discipline of Urdu langauge and literature:

In the history of Urdu literature, Sir Syed has become a